فقہ اور اصول فقہ کی تدریس میں تخلیقی طرز فکر

فرید زوزو

کلیۃ الشریعۃ والقانون، جامعۃ العلوم الاسلامیہ، ملیشیا

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : فقہ اور اصول فقہ کی تدریس میں تخلیقی طرز فکر
تصنیف : فرید زوزو
صفحات :
سن طباعت : فروری ۲۰۱۲
قیمت :

ناشر

ایفا پبلیکیشنز
۱۶۱-ایف، بیسمنٹ، جوگا بائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸
جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵
فون: 011-26983728, 26981327
ای میل: ifapublication@gmail.com

مجلس ادارت

۱- مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی

۲- مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

۳- مولانا بدر الحسن قاسمی

۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

۵- مولانا عتیق احمد بستوی

۶- مفتی محمد عبید اللہ اسعدی

not found.

فہرست

مقدمہ	۳
۱-تدریس کے روایتی طریقے اور تخلیقی طرز فکر	٦
۲-حرکت ونشاط سے معمور جدید طریقۂ تعلیم	۱۲
۳-تعلیمی سرگرمیوں میں تخلیقی طرز فکر کے معیارات	۱۴
۴-اصول فقہ کے نصاب کی تجدید کے دعوے میں تخلیقیت کی جھلک	۴۰
خاتمہ	۴۴
حاشیہ	۴۵

مقدمہ

آج مسلمانوں کو بڑے بڑے چیلنجوں اور متعدد پیچیدہ قسم کے مسائل کا سامنا ہے۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کو درپیش آفات ومصائب کا سلسلہ اس قدر طویل ہے کہ انہیں شمار نہیں کیا جاسکتا، ان تمام مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لئے ایک ماہر فن مجتہد کے فکر ونظر اور صورتحال پر گہری نگاہ رکھنے والے بابصیرت فقیہ کی ضرورت ہے۔ ان پیچیدہ مسائل کا حل گہری مجتہدانہ فکر ونظر کا استعمال کئے بغیر صرف قدیم فقہی ذخائر میں غوطہ زنی سے نہیں نکالا جاسکتا ہے۔ عصر حاضر کے مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لئے ایک فقیہ کے لئے ضروری ہے کہ اسے اجتہاد کے وسائل وذرائع کا علم ہو، معاشرہ میں پیش آنے والے نئے نئے امور ومعاملات پر اس کی گہری نگاہ ہو، اس کے بعد ہی وہ شریعت اسلامی کے اصول وضوابط کے مطابق نئے نئے واقعات وحوادث پر غور وفکر کرنے پر قادر ہوگا، اس لئے کہ موجودہ دور میں درپیش صورتحال پیچیدہ اور آفات ومصائب کی شکلیں مختلف اور متنوع ہیں، لہٰذا اگر ہم آج کے ان مسائل کا حل ڈھونڈنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی فکر ونظر میں گہرائی ووسعت پیدا کرنی ہوگی اور ان پیچیدہ معاملات کا حل ڈھونڈنے کے لئے اپنی فکری قوت وصلاحیت کو مہمیز کرنا ہوگا۔ موجودہ دور کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ٹریننگ ومشق کی بھی ضرورت ہے۔ اس مشق ومزاولت کا سلسلہ زمانہ طالب علمی میں مدارس سے شروع ہوکر میدان عمل میں اترنے تک جاری رہنا چاہئے۔ ایک مسلمان طالب علم کو تنقیدی شعور کے حامل گہرے غور وفکر کا

نوٹ: زیر نظر تحریر ایک تحقیقی مقالہ ہے جسے بتاریخ ۴ر تا ۶ر اگست ۲۰۰۴ء مرکز بوتر برائے عالمی تجارت کوالالمپور میں ''الاسلام والمسلمون فی القرن الواحد والعشرین، الصورۃ والواقع'' کے عنوان سے منعقد بین الاقوامی کانفرنس میں پیش کیا گیا۔

ملکہ اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے مشق کرنی چاہئے، اس کے بعد ہی شرعی تقاضے کے مطابق اپنے معاشرتی مسائل ومشکلات کا حل ڈھونڈنے کے لئے تخلیقی طرز فکر تک اس کی رسائی ممکن ہو پائیگی۔ اس کام کے لئے رائج نظام تعلیم پر عموماً اور اسلامی علوم وفنون کی تدریس کے نظام تعلیم پر خصوصاً نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ اسے اس اہم ترین مقصد سے جوڑا جاسکے جس کے لئے امت مسلمہ کو دنیا کی دوسری قوموں اور تمام انسانوں کے حق میں شہادت حق کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ موجودہ دور میں جو طریقۂ تدریس رائج ہے وہ اپنے ان بلند اغراض ومقاصد سے دور ہو چکا ہے جس کے لئے اس کا وجود ہوا تھا، کیونکہ وہ امت کی ضرورتوں پر لبیک کہنے، اس کے مسائل کا حل ڈھونڈنے اور اس کے اصول وضوابط کی تنفیذ میں بالکل ناکام نظر آرہا ہے۔ یہاں علوم اسلامیہ کی تدریس کے اغراض ومقاصد پر تھوڑی سی گفتگو ضروری ہے۔ کیا ان اسلامی علوم کی تدریس کا مقصد مجتہد ومفسر کی شروط کو جاننا ہے یا اجتہاد وقیاس کے وسائل اور طریقوں کا علم حاصل کرنا ہے یا پھر اس کا مقصد شرائط وضوابط جائز انشورنس کارڈ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہے؟

یہاں یہ واضح ہونا چاہئے کہ آج کے درپیش مسائل کے لئے ہم اپنے پیشرو فقہائے کرام کو ہدف لعنت وتنقید نہیں بنا سکتے جنہوں نے اپنے اپنے ادوار میں مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے اجتہاد کیا اور اس زمانے کے حالات وظروف کے اعتبار سے شرعی احکامات کو انسانی زندگی میں نافذ کرنے کے لئے نئے طریقے پیش کئے۔ آج کے دور میں ہمیں جن مسائل وحالات کا سامنا ہے اس کے لئے اُن قدیم فقہاء کا محاسبہ ومحاکمہ کرنا ہمارے لئے درست نہیں ہے، اس لئے کہ کمی ان قدیم فقہی کتب کے ذخائر میں نہیں ہے جس نے اپنے زمانہ کا ساتھ دیا بلکہ کمی دراصل ہمارے اپنے انداز اور فکر میں ہے کہ ہم ان قدیم فقہاء کے طریقۂ تالیف کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان لوگوں نے جس طرح اپنے دور کے مسائل کا حل پیش کیا اس طریقہ سے ہم آج کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی حال ہمارا اس معاملہ میں بھی

ہے کہ ہم بغیر سوچے سمجھے مغرب کے نظام تعلیم کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

آج اسلامی علوم، ان کا طریقۂ تدریس، وسائل تعلیم، تفصیلی مواد اور اس کے متعلقہ امور کا گہرائی سے جائزہ لینے والا انسان، موضوعات کے انتخاب، ان کی تدریس وتعلیم اوران سے اخذ واستفادہ کے معاملہ میں ایک تقلیدی انداز کا مشاہدہ کرتا ہے۔آج کے حالات میں اس کا صرف یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ طالب علم بے رغبتی اور اکتاہٹ کے ساتھ اس درس کو قبول کرتا ہے۔ طالب علم کو اس طرح کے غیر مفید درس سے صرف یہی پیغام حاصل ہوتا ہے کہ اسے کسی طرح اس درس کو دل ودماغ میں محفوظ کرلینا ہے پھر امتحان کے زمانہ میں امتحان کی کاپی پر اسے منتقل کردینا ہے۔اس تقلیدی انداز کے طریقۂ تعلیم کی وجہ سے اس تنقیدی فکر اور تخلیقی فہم وبصیرت کا مکمل فقدان ہوجاتا ہے جو زمانے کے لئے نئے مسائل پر غور وفکر کرنے اور ان کا تجزیہ واستنباط کرنے میں معاون ہوسکتا ہے۔اس کی وجہ سے طالب علم کے ذہن سے یہ حقیقت بالکل اوجھل ہوکر رہ جاتی ہے کہ اس درس کا مقصد جو انسان کے مقصد وجود سے جڑا ہوا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے لئے عبودیت کا اثبات ہے۔ زیر نظر تحقیقی مقالہ میں اسلامی علوم کے موجودہ طریقۂ تدریس کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس میں جہاں خامیاں موجود ہیں ان کی نشاندہی کی گئی ہے، تاکہ تخلیقی غور وفکر کی بنیاد رکھنے والے اس متبادل طریقۂ تعلیم کو سامنے لایا جاسکے جس سے موجودہ دور میں اساتذہ وطلبہ کو یکساں طور پر استفادہ کا موقع حاصل ہو۔اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسلامی علوم بالخصوص فقہ واصول فقہ کی تدریس کا جو اصل مقصد ہے وہ حاصل ہو اور موجودہ دور کے اساتذہ وطلبہ اپنے معاشرہ میں تیزی کے ساتھ رونما ہونے والی تبدیلیوں اور انقلابات زمانہ کا ساتھ دینے کے اہل بن سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ صرف فقہی ذخائر میں غوطہ زنی کرتے رہیں جبکہ انسانی معاشرہ در- درپیش مسائل ومشکلات کی وجہ سے شرعی احکام اور فقہی فکر ونظر سے دور ہوکر رہ جائے۔

زیر نظر مقالہ میں اصول فقہ اور فقہ کے دیگر نصاب تعلیم مثلاً مادۂ فقہ بالخصوص فقہ

معاملات، فقہ معاصر، فقہ مقارن اور مادہ فقہی قواعد کی تدریس کا دو اعتبار سے جائزہ لیا گیا ہے؛ ایک تو یہ کہ یہ سارے مواد اختصاص کے لئے پڑھائے جائیں اور دوسرے یہ کہ انہیں ایسے نصاب تعلیم کے طور پر پڑھایا جائے جن کے ذریعہ شرعی احکام کے استنباط واستخراج میں وحی کے نصوص کے ساتھ انسانی عقل وفکر کو ہم آہنگ بنانے کے لئے ایک علمی منہج کو سامنے لایا جاسکے، یہ تمام گوشے مقالہ کے مشتملات سے اجاگر ہو جائیں گے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلامی علوم وفنون کی تعلیم کے بنیادی مقاصد حسب ذیل ہیں: معاشرہ میں پیغام کے حامل فرد مسلم کی فراہمی، ایک مسلم طالب علم کی شخصیت کے اندر پنہاں تخلیقی طاقت وصلاحیت کو نکھار کر سامنے لانا، انسان کی علمی پرواز کو بنیادی عقائد کی خوراک فراہم کرنا، اسلامی تعلیم کا امت مسلمہ کی ضرورتوں کے ساتھ رشتہ استوار کرنا، اسلامی تعلیم کو معاشرہ کی عملی زندگی کی خدمت پر مامور کرنا۔ ان بنیادی مقاصد کے ساتھ تعلیم کے ایک عام مقصد کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے اور وہ ہے معاشرہ کی خدمت کے لئے ایسے متحرک اور تخلیقی صلاحیت سے مالا مال تعلیم یافتہ افراد کی فراہمی جو نئی چیزیں پیش کرنے اور متعدد متبادل پر غور وفکر کی قدرت رکھتے ہوں (۱)۔

☆☆☆

تدریس کے روایتی طریقے اور تخلیقی طرز فکر

دنیا میں رائج تعلیم کے طریقوں سے عمومی طور پر اور اسلامی علوم کی تدریس کے طریقوں سے خصوصی طور پر جنہیں واقفیت ہے وہ یہی دیکھتے ہیں کہ دنیا میں آج بھی تدریس کا وہی اسلوب رائج ہے جو کئی دہائیوں سے چلا آ رہا ہے۔ تقریبا ہر یونیورسٹی اور اسلامی علوم کی تدریس کے ہر ادارے، تمام مسلم ممالک اور دنیا کے وہ تمام ممالک جہاں اسلامی علوم کی تدریس کا انتظام ہے یا ہر جگہ یہی قدیم طریقۂ تدریس کا چلن عام ہے۔ ''ہمارے یہاں تعلیم دینے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ طالب کے سامنے کسی سبق کو پیش کر دیا جائے، وہ اسے یاد کر لے اور اس کی یاد داشت میں کچھ اضافہ کر دیا جائے۔ طالب کے اندر غور وفکر، مقارنہ (موازنہ)، دو مختلف چیزوں کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کی فکری صلاحیت کو پروان چڑھانے سے عموماً معلم کو کوئی سروکار نہیں ہوتا'' (۲)۔ میں نے اپنے وطن الجزائر میں پھر اپنے وطن ثانی ملیشیا میں متعدد قومیتوں کے مسلمان طلبہ جن میں عرب وغیر عرب سب تھے، کو پڑھاتے وقت اس حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے کہ طلبہ کے ذریعہ معلومات کو اخذ کرنے کا عمومی طریقہ آج بھی یہی ہے کہ ان کے سامنے سبق کو پیش کر دیا جاتا ہے اور اسے وہ اپنے یادداشت میں محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی توضیح وتشریح کے وقت شجرہ کی بھی نشاندہی کر دی جاتی ہے، قدیم طریقہ تعلیم کا یہ پہلا عیب ہے۔ آج بھی طالب علم کے ذہن میں معلومات کو جمع کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ عام طور پر مدرسین اسی طریقۂ تعلیم کو اپنائے ہوئے ہیں حتی کہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی اسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ طالب علم اپنی پوری تعلیمی زندگی کے دوران صرف معلومات کا ذخیرہ اپنے ذہن

ودماغ میں جمع کرنے کے مرحلہ سے گزرتا رہتا ہے۔ اسے فطری انداز میں مشق وریاضت کے ذریعہ پورے مادہ کا احاطہ کرنے کا کبھی موقع ہی نہیں مل پاتا ہے۔ اخیر میں تعلیمی سال کے اختتام پر یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اس نے جو کچھ یاد کیا ہوتا ہے سب اس کے ذہن ودماغ کے پردہ سے غائب ہوجاتا ہے۔ یہ بات حد درجہ تکلیف دہ اور افسوسناک ہے کہ فقہ اور دیگر اسلامی علوم کی تدریس کو آج بالعموم اس طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس لئے کہ ان علوم اسلامیہ کو پڑھنے کے بعد عام طور پر صرف فقہ کے حافظ وحاملین پیدا ہورہے ہیں، فقہاء نہیں پیدا ہورہے ہیں۔ نقلی اتارنے والوں کی جماعت تو پیدا ہورہی ہے جو زندگی بھر ذہن ودماغ میں کچھ بھرنے پھر اسے خالی کرنے اور طلبہ کے سامنے طوطے کی طرح رٹے رٹائے انداز میں سبق دہرانے کا کام تو کرتے ہیں لیکن وہ ایسے مفکرین ومجتہدین نہیں بن پاتے جو دوسروں کی عقلی وفکری تربیت کرسکیں اور دوسروں کے اندر فکری وتخلیقی صلاحیت کو پروان چڑھاسکیں'' (۳)۔

ان ملاحظات کے بعد جس نتیجہ تک ہم پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں رائج طریقۂ تدریس سراسر عیب ونقص کا حامل ہے، کیونکہ آج کے طلبہ اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں، جو درس وہ مدرسہ یا جامعہ کی چہار دیواری کے اندر حاصل کرتے ہیں آج اس سے زیادہ ان کے لئے یہ بات اہم ہوگئی ہے کہ ادارہ سے باہر کے جو حالات ان کے منتظر ہیں ان کا وہ کیسے سامنا کریں گے؟ لہذا اگر غور کیا جائے تو اصل عیب ونقص بذات خود طریقۂ تدریس کے اندر نہیں ہے بلکہ اصل عیب مدرس یا مخاطب کے ذریعہ اس کے استعمال اور وقت کے ساتھ اسے ہم آہنگ نہ کرنے کے اندر پایا جاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ طلبہ کے سامنے سبق پیش کرنے اور انہیں یاد کرادینے کا قدیم طریقۂ تدریس شرعی علوم کی تحصیل میں مشغول پہلے دور کے ان طلبہ کے لئے مفید اور بہتر تھا جو چھوٹے مکاتب اور مساجد کے اندر جاکر دینی علوم کو حاصل کرتے تھے، کیونکہ اس دور میں کتابیں، کاپیاں اور تعلیم کے دیگر وسائل کمیاب تھے، لیکن آج کے اس جدید دور میں جبکہ نصابی

کتابوں اور جدید وسائل تدریس کی فراوانی ہوچکی ہے صرف اس قدیم طریقۂ تدریس پر انحصار کرنا وقت کا ضیاع اور حالات وظروف سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھانے کے مترادف ہوگا۔ آج کے اس نئے دور میں تعلیم وتدریس کے میدان میں جس بات کے لئے ہم کوشاں ہیں وہ یہ ہے کہ اکیسویں صدی کے مدارس وجامعات کے اندر منہج تدریس کو تبدیل کیا جائے، مواد کو صرف رٹنے اور ذہن ودماغ میں محفوظ کرنے کے طریقہ سے آگے بڑھ کر مواد کے فہم، تفسیر، مقارنہ اور نقد وامتیاز کے طریقہ کو اختیار کیا جائے؟ تاکہ تدریس کے اعلیٰ مقاصد واہداف جن کا ذکر اوپر کی سطروں میں ہوا ہے، حاصل ہوں اور اس کا طریقۂ کار یہ ہوسکتا ہے کہ درس کے اہداف اور اس سے متعلق سرگرمیوں میں مشارکت کے لئے طلبہ کی ہمت افزائی کی جائے، نیز وہ پہلے اپنی علمی سرگرمیوں اور درس کے اہداف کی تعیین کریں، اس کے لئے بھی ان کی تشجیع ضروری ہے'' (۴)۔

موجودہ دور میں رائج ناقص طریقۂ تعلیم کا ذکر جاری رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مدرسین علمی مواد کو بالکل خشک اور غیر دلچسپ انداز میں طلبہ کے سامنے دہراتے ہیں جس کے اندر مقصد اصلی کا مکمل فقدان ہوتا ہے اور وہ مقصد اصلی ایمان کی اساس کو انسان کی شخصیت کے اندر مضبوط ومستحکم کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ یہی ایمانی اساس طلبہ کے اندر ہمت وحوصلہ اور عزم وارادہ کی طاقت پیدا کرتی ہے جس کے بل بوتے پر وہ بحث وتحقیق اور حصول علم کے میدان میں آگے بڑھتے ہیں۔ ''ہمیں آج علمی محرک کی شدید ضرورت ہے، اس لئے کہ آج حقیقت میں ہمارے مدارس ومعاہد کے اندر جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ ہمارے ایمان، ہماری تہذیب اور ہمارے طرز حیات سے میل نہیں کھاتا'' (۵)۔ یہ بات مسلم ہے کہ اگر ہر درس الگ الگ طور پر ایمانی تاثیر سے لبریز ہو تو وہ امت کی ضروریات اور اس کے تقاضوں کے ساتھ اس کا رشتہ استوار کرنے میں اپنا بھرپور رول ادا کرے گا۔ علاوہ ازیں اس کے ذریعہ طلبہ کے دلوں میں

علم کی محبت پیدا کرنا ممکن ہوگا اور اسی کے بعد ہی عقلی اور عملی طور پر ان کی صحیح نشونما ہو پائے گی اور تبھی وہ فعال ومتحرک اور پیداواری صلاحیت سے مالا مال افراد کی حیثیت سے زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھ سکیں گے۔

بلاد اسلامیہ میں تعلیم سالانہ یا ششماہی نصاب تعلیم کی تکمیل ہی کا نام نہیں ہے کہ اس مرحلہ سے گزرنے کے بعد طالب علم ایک امتحان کے مرحلہ میں داخل ہو اور اسے پاس کر جائے بلکہ بلاد اسلامیہ میں تعلیم کا امت اسلامیہ کی تعمیر وترقی سے گہرا تعلق ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کی ضروریات اور ان کے تقاضوں پر اس کی نگاہ ہوتی ہے، تاکہ ایک مسلم طالب علم مرحلۂ تعلیم سے گزرتے ہوئے اپنے دین اور علم کے ذریعہ تہذیبی طور پر فوقیت کا حامل بن جائے۔ مثال کے طور پر فقہ معاصر کی تعلیم دینے کا ہمارا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ معاشرہ میں ہمیں جن مشکلات وچیلنجوں کا سامنا ہے ان کے حل اور مداوے تک ہماری رسائی ہو جائے بلکہ اس کی تعلیم ہم اس لئے دیتے ہیں تاکہ طالب علم معاشرہ میں پیش آنے والے واقعات وحوادث کا صحیح اندازہ لگا کر اس کے لئے شرعی احکام کے استنباط کے صحیح طریقے سے واقف ہو جائے، اس لئے کہ آج معاشرہ میں پیش آنے والے بہت سے نئے امور ومعاملات کے لئے کوئی صریح نص موجود ہی نہیں ہے جس سے ان کا حکم معلوم ہو سکے۔ یہاں پر ایک مسلمان طالب علم کو شرعی حکم کے ادراک کے لئے امتیازی شان رکھنے والے ان منظّم ومربوط طریقوں ہی کی پیروی کرنی ہوگی جن کے ذریعہ نصوص کی عدم موجودگی میں حکم شرعی دریافت کیا جاتا ہے، اگرچہ ان امور میں کوئی واضح اور محکم نص موجود ہی نہ ہو۔ حصول تعلیم کے دوران جب طالب علم اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ اس کے استاذ نے شرعی مقاصد سے متعلق اصول وضوابط کو استعمال کر کے نئے درپیش معاملہ میں آسانی کے ساتھ شرعی حکم تک رسائی حاصل کر لی تو گویا اس عمل کے ذریعہ طالب علم کو ایک طرح کی مشق اور ٹریننگ حاصل ہوتی ہے کہ جن معاملات ومسائل میں رہنمائی کے لئے نص موجود نہیں ہے ان میں مقاصد

شریعت کا استعمال کر کے وہ احکام شرعی کا استخراج کس طرح آسانی کے ساتھ کرسکتا ہے۔ اس سے طالب علم کے دل میں اللہ کی نازل کردہ اس شریعت کے بارے میں یہ یقین مزید راسخ و مستحکم ہوتا ہے کہ یہ ایک زندہ جاوید اور قیامت تک باقی رہنے والی شریعت ہے، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مشکل نہیں بلکہ آسان بنا کر نازل کیا ہے اور یہ امت مسلمہ روئے زمین پر خلافت و جانشینی کی صحیح حقدار اور دوسری قوموں کے حق میں شاہد و گواہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے برخلاف جب مدرس طالب علم کے سامنے صرف رٹے رٹائے انداز میں سبق کو دہرانے کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور سبق کو پیش کرتے وقت اس کا منطقی و عقلی تجزیہ نہیں کرتا ہے جسے تدریس کا دوسرا بڑا عیب کہا جاسکتا ہے تو طالب علم اس مادہ کو پڑھتے وقت سستی و بے رغبتی کا شکار ہو کر جمائی لیتا ہے، اونگھتا ہے یا سادہ کاغذ پر دوران درس آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا ہے یا پھر بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا ہے کیونکہ وہ گھنٹی ختم ہونے کا بے قراری کے ساتھ منتظر ہوتا ہے۔ مؤثر انداز میں معلومات کو جمع کرنے اور سمیٹنے کا کوئی محرک اسے نہیں ملتا ہے جو مدرس کی طرف اس کی توجہ مبذول رکھ سکے۔ اگر ہم سبق دہرانے کے اس غیر دلچسپ طریقہ کے بدلہ میں سبق کو طالب علم کے دل میں اتارنے اور اسے مطمئن کرنے کا طریقہ اختیار کریں تو تعلیم و تعلم کے یہ محرکات اسے تخلیقی انداز اختیار کرنے کی طرف لے جائیں گے اور پھر وہ مناقشہ کی راہ اختیار کرتے ہوئے فوراً سوالات کا سلسلہ شروع کردے گا۔

طالب علم کا امتحان لینے اور اسے جانچنے اور پرکھنے کا جب وقت آتا ہے تو استاذ نے اسے جو کچھ دیا ہے وہ سب ان کو واپس لوٹاتا ہے۔ اس وقت طالب علم سے یہ مطلوب ہوتا ہے کہ اس نے استاذ سے جو کچھ سنا ہے اسے بے کم و کاست حرف بحرف لوٹا دے۔ اس وقت طالب نہ تو تجزیہ کرتا ہے اور نہ مناقشہ کی راہ اپناتا ہے، اس لئے کہ امتحان کے سوالات اسے متعین و محفوظ انداز میں جواب دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ طریقۂ تعلیم کا تیسرا اور زیادہ بڑا عیب ہے۔ سوال

پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ طالب کو جانچنے و پرکھنے کا مقصد ''یہ جاننے کی کوشش ہے کہ طالب علم مطلوبہ اہداف تک پہنچنے میں کہاں تک کامیاب ہوسکا، نیز زندگی کے اگلے مرحلۂ تدریس کے طے شدہ اہداف میں کہاں تک اس کی رسائی ہوسکی'' (۶)۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ طالب علم امتحان کے موقع پر اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیت وقوت کو بروئے کار لاکر مادہ کا مکمل احاطہ کرنے اور تطبیق، تجزیہ اور مشق کے ذریعہ اسے دل ودماغ میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس موقع سے استاذ کے سوال نے اسے تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے پر ابھار دیا اور اس کی عقل اور مادہ کا احاطہ کرنے والی اس کی قدرت وصلاحیت کو تعمیری تنقید اور مادہ کی تشریح وتجزیہ کی طرف متوجہ کردیا تو سمجھ لیجئے کہ طالب علم کے سامنے تعلم کے جو اہداف تھے وہ پورے ہوگئے، کیونکہ طالب علم سے ہمیں یہی مطلوب ہے کہ اس نے درس کو جتنا سمجھا ہے وہ اس کے دل ودماغ میں رچ بس جائے تاکہ وہ زندگی کے اگلے مرحلہ میں اپنی تعمیر وترقی کے لئے کوشاں امت مسلمہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بن سکے۔ یہاں سے اس جدید طریقۂ تعلیم پر گفتگو ضروری معلوم ہوتی ہے جن کے ذریعہ موجودہ طریقۂ تعلیم کے ان تینوں عیوب کا خاتمہ ممکن ہوسکتا ہے جن کی نشاندہی گذشتہ سطور میں کی گئی ہے۔

☆☆☆

حرکت ونشاط سے معمور جدید طریقۂ تعلیم

زیادہ تر اسلامی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں رائج قدیم طریقۂ تعلیم کا مختصر طور پر جائزہ لینے کے بعد ہم آنے والی سطور میں اس جدید طریقۂ تعلیم پر روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں جن کے ذریعہ قدیم طریقۂ تعلیم کے اندر پائے جانے والے عیوب ونقائص کا خاتمہ ممکن ہے تاکہ شرعی علوم کے طلبہ اور ان کے اساتذہ کی تخلیقی صلاحیت کو پروان چڑھانے کا مقصد حاصل ہو۔ آج جس معاشرہ میں وہ سانس لے رہے ہیں وہ ان سے اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ طریقۂ تعلیم میں خاطر خواہ تبدیلی وجدت (Globlisation) لاکر اسے امت مسلمہ کی نشأۃ ثانیہ کے تقاضے کے مطابق بنائیں اور اس دور عالم کاری کے چیلنجوں کا سامنا کریں۔'' یہ بالکل عیاں ہے کہ آج ہمارے مدارس وجامعات میں علوم اسلامی کی تدریس کا جو طریقہ رائج ہے وہ مذکورہ بالا اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے بالکل مناسب ہے، اس لئے اس مسئلہ پر گہرائی وسنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کرنا ہمارا فرض ہے'' (۷)۔

یہاں پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ طریقۂ تعلیم کو تبدیل کرنے کے مطالبہ کا بنیادی مقصد امت مسلمہ کی نشأۃ ثانیہ کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا ہے، اس عمل سے نہ تو کوئی سیاسی اصلاح مقصود ہے اور نہ ہی طلبہ کی بے رغبتی اور زمانے کے تقاضوں سے ان کی غفلت سے ناخوش لوگوں کے کہنے پر یہ مطالبہ کیا جارہا ہے۔ طریقۂ تعلیم کی تبدیلی کے مطالبہ کے پیچھے یہ مقصد ہے ہی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ 'بیسویں صدی کی آخری دہائی سے انسانی معاشرہ جن بین الاقوامی تبدیلیوں کے دور سے گزر رہا ہے اور جس کے خدوخال اکیسویں صدی کے آغاز پر مزید واضح ہوکر سامنے آگئے ہیں۔ یہ بدلے ہوئے حالات ہمیں اس بات کے لئے مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنے فکری

وتربیتی رجحانات، نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں جوہری تبدیلی لائیں؛ کیونکہ وہ دور جدید کے تقاضوں اور بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے کے لائق نہیں رہ گئے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے مسلم ممالک میں تعلیم ایک طویل عرصہ سے کچھ ایسی صورتحال سے دوچار ہے کہ معاشرہ کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا ہے'' (۸)۔ مقصد یہ ہے کہ ہم طریقۂ تعلیم میں تبدیلی لاکر طلبہ کے اندر تخلیقی انداز میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت پیدا کریں تاکہ امت کی نشأۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوسکے، طلبہ امت کی ضرورتوں پر غور وفکر کرنے کے لائق بن سکیں اور تدریس وتربیت کا جو اصل مقصد ہے کہ تخلیقی صلاحیت سے مالا مال افراد فراہم کئے جائیں جو صبر وسکون اور سنجیدگی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہنے کا جذبہ رکھتے ہوں، وہ پورا ہو۔ ان نیک مقاصد کے حصول کے لئے ہمیں سب سے پہلے تخلیقی انداز میں غور وفکر کی ماہیت اور اس کے اسالیب کو جاننا ضروری ومناسب ہوگا، پھر علوم اسلامی کے نصاب تعلیم میں اس کی عملی مشق کرانے پر توجہ دینی ہوگی۔

ماہرین نے ''اِبداع'' (تخلیقیت) کی تعریف دوطرح سے کی ہے:

(۱) ''غور وفکر کے روایتی انداز کو چھوڑ کر غور وفکر کا یکسر مختلف انداز اختیار کرنے کے لئے اپنی تمام تر قدرت وصلاحیت کو بروئے کار لاکر اس کے لئے پیش رفت کرنا'' (۹)۔

(۲) ''عام اور مانوس چیزوں پر عام روش سے ہٹ کر غیر روایتی انداز میں غور وفکر سے جو کچھ حاصل ہو وہ ''اِبداع'' (تخلیقیت) ہے'' (۱۰)۔

اسی کے مماثل ''التفکیر الابتکاری'' کی اصطلاح بھی ہے، جس کا مطلب ہے قدر وقیمت کے حامل نوع بنوع افکار وخیالات کو پہلی مرتبہ منصۂ شہود پر لانے کی قدرت وصلاحیت بایں طور کہ وہ افکار وخیالات انسان کی عملی وفکری زندگی پر مثبت طور پر اثر انداز ہوسکیں۔ ''الابتکار'' بامقصد اور جدت کی حامل پیداواری صلاحیت کا نام ہے جو نئے رشتوں اور تعلقات کو وجود میں

لاکر طلبہ کی بے رغبتی وغفلت کی صورتحال کو ایک انقلاب وتبدیلی سے ہمکنار کر دیتی ہے، جس کی وجہ سے ایک طالب علم رٹنے اور حفظ کرنے کے عمل سے اوپر اٹھ کر غور وفکر، تحقیق وتجزیہ، نتیجہ اخذ کرنے اور پھر ایک بالکل نئی چیز سامنے لانے کے مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے(۱۱)۔

تخلیقی طرز فکر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے ذریعہ ایک طالب علم کے اندر ایسی پختہ عقل وفکر کی تعمیر کی جاسکتی ہے جو اس طالب کے سامنے سے گزرنے والے تمام افکار کو پرکھنے اور اس کا مناقشہ وتجزیہ کرنے پر قادر ہوگی۔ اس سے طرز فکر میں نرمی اور متانت وسنجیدلی پیدا ہوگی، طالب کو انقلابات زمانہ کا اندازہ لگانے میں اس سے مدد ملے گی، اس کے ذریعہ معاشرہ میں ترقی کے ساتھ تعلیم کا رشتہ استوار کرنا ممکن ہوگا، یہ معاشرہ اور قوم کے تقاضوں سے واقف تعلیم یافتہ افراد کی فراہمی کو یقینی بنائے گا۔ شرعی علوم میں تخلیقی طرز فکر کا مطلب ہوتا ہے کہ طالب علم کو دلائل پر غور وفکر کی قدرت حاصل ہو، وہ مقاصد شریعت کا مکمل احاطہ کر کے اور اجتہاد کی بنیادوں سے واقفیت حاصل کر کے اجتہاد کے وسائل اور استنباط احکام کے اصول تک رسائی حاصل کر لے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ تخلیقی طرز فکر جو ہم پہلے اساتذہ کے اندر پھر طلبہ کے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ شرعی دلائل میں غور وفکر کی قدرت حاصل ہو، شریعت کے اساسیات کا احاطہ اس طور پر اس کے لئے ممکن ہو کہ ضرورت کے وقت اس کا استحضار اور منہجی واصولی طور پر اس کا استعمال اس کے لئے ممکن ہو پھر وہ زمانہ کے نئے نئے مسائل کا کامیابی کے ساتھ سامنا کر سکے اور اس کے لئے حل ڈھونڈ سکے۔

☆☆☆

تعلیمی سرگرمیوں میں تخلیقی طرز فکر کے معیارات

۱-تخلیقی طرز فکر مدرس کی سطح پر: طریقۂ تعلیم میں تخلیقی طرز فکر پر گفتگو سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس شخصیت کے بارے میں بات کی جائے جو تخلیقی طرز فکر کو سب سے پہلے روبہ عمل لانے کا مکلّف ہے اور وہ مدرس کی شخصیت ہے جو طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم کا موجد اور اس کا نقشہ ساز ہوتا ہے، اس لئے کہ تخلیقی طرز فکر کے حامل طریقۂ تعلیم کا وجود افادیت ومعنویت سے خالی طریقۂ تعلیم کے ذریعہ نہیں ہوسکتا ہے بلکہ تنقیدی شعور اور جدت کے حامل تخلیقی طرز فکر کو اپنا کر جو طریقۂ تعلیم وضع کیا گیا ہوگا اس کے ذریعہ ہی اس کا وجود ہوسکتا ہے، جس میں وسائل تعلیم پر انحصار کیا گیا ہو اور عقلی وفکری سرگرمیوں کی اس میں رعایت کی گئی ہو مثلاً علم وجانکاری، فہم وتلقین، تشریح، تجزیہ اور تنقید اور اخیر میں اس کا محاسبہ کرنا اور اندازہ لگانا کہ طالب علم موضوع کا کس حد تک احاطہ کرنے میں کامیاب ہوسکا۔ ان تمام امور کو انجام دینے میں وہی مدرس کامیاب ہو پاتا ہے جو تربیتی مشق کے تمام اہداف کا احاطہ کئے ہوئے ہو، تعلیم وتربیت کے میدان میں متحرک رول ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اپنے زیر تدریس مواد کا ہر پہلو سے اس نے احاطہ کیا ہو۔ اصل مصادر ومراجع کی طرف رجوع کر کے اس مواد کو اچھی طرح سمجھنے کی اس کے اندر قدرت وصلاحیت ہو اور پھر اسے اجتہاد کے تمام وسائل وذرائع کا مکمل علم ہو، تاکہ معاشرہ میں پیش آنے والے آفات ومسائل کا حل ڈھونڈتے وقت اسے استعمال کر سکے۔ چنانچہ حرکت ونشاط سے لبریز طریقۂ تعلیم جس کی بنیاد تخلیقی طرز فکر پر ہوتی ہے اس کا اصل انحصار مدرس کی ممتاز ومتحرک شخصیت پر ہوتا ہے، کیونکہ اس کے اندر امت مسلمہ کو درپیش چیلنجوں کے لئے مناسب انداز میں تیاری کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ مدرس کا کام کی اہمیت پر پختہ ایمان ہوتا کہ وہ تدریس کے مقاصد کو پورا کر سکے، نیز تدریس کی اہمیت پر اس کا ایمان ہو؛ جو تخلیقیت اور امت کی ترقی کی بنیاد ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے جو عمل درکار ہے اس کے بنیادی طور پر دو پہلو ہیں: پہلے تو مدرس خود اپنے اندر تخلیقی طرز فکر کی مہارت پیدا کرے پھر وہ طلبہ کو اس بات کے لئے راغب کرے کہ وہ اپنے اندر تخلیقی طرز فکر کی مہارت پیدا کریں۔ مدرس کو سب سے پہلے اپنے اندر تخلیقی طرز فکر کی مہارت پیدا کرنے کے لئے مطالعہ کے عمل کو مسلسل جاری رکھنا ہوگا اور موضوع سے متعلق مکتبات کی نئی نئی مطبوعات پر گہری نگاہ رکھنی ہوگی، اس لئے کہ انسانی افکار وخیالات میں پختگی اور بلندی اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب لوگ ایک دوسرے کے سامنے اپنے اپنے افکار وخیالات کا اظہار کرتے ہیں اور جب ایک خیال کے حامل چند لوگ یا مختلف آراء وخیالات کے حامل افراد باہم مناقشہ کا عمل شروع کرتے ہیں تو مناقشہ ومباحثہ کی وجہ سے بہت سے سوالات اور استفسارات سامنے آتے ہیں جس کے لئے محقق کو نئی معلومات کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مناقشہ سے کئی ایسی معلومات بھی انسان کو حاصل ہوتی ہیں جن سے وہ اب تک ناواقف تھا۔ تمام محققین اپنی تحقیقات اور علمی کتابوں کے معیارات کے اعتبار سے کیساں نہیں ہوتے۔ مطالعہ کا عمل مسلسل جاری رکھنے کی وجہ سے مدرس کے ذہن ودماغ میں افکار وخیالات کے نئے نئے دریچے کھلتے ہیں جو اسے یومیہ درس وتدریس کے عمل کو نئے انداز سے جاری رکھنے میں مدد دیتے ہیں اور ایک ہی انداز میں رٹے رٹائے طریقہ سے معلومات کو دہرانے کے نقص وعیب سے اسے نجات مل جاتی ہے۔ مطالعہ کی کثرت کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اسے ایک بات کو بار بار دہرانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس کے لئے نئے نئے الفاظ اور نئی تعبیرات استعمال کرنے پر قادر ہوتا ہے جو طالب کے اندر اکتاہٹ اور بے رغبتی پیدا نہیں کرتے۔

اس قسم کے فوائد کا حصول علمی بحوث ومقالات تیار کرنے سے بھی ہوسکتا ہے، چاہے وہ

تحقیقی مقالات فرد واحد کے ذریعہ لکھے جائیں یا ایک ادارہ کے کئی اساتذہ مل کر اجتماعی طور پر اسے تیار کریں یا کئی اداروں کے باشین اور اہل علم مل کر اسے تیار کریں یا وہ مقالات کسی علمی و تحقیقی ادارہ کی جانب سے تیار کرائیں جائیں یا چاہے وہ عام جرائد و مجلّات میں شائع ہونے والے علمی و تحقیقی مقالات ہی کیوں نہ ہوں۔ ان علمی و تحقیقی مقالات کی تیاری کا مقصود صرف مشق اور حصول تربیت کے میدان میں ترقی کی منزل طے کرنا نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ قوم وملت کو درپیش مسائل کا سامنا کرنے اور اس کا حل ڈھونڈنے کے لئے ایک ابتدائی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ مدرس کا کام کلاس روم میں صرف درس وتدریس کی ذمہ داری ادا کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی نگاہ معاشرہ کی ضرورتوں پر بھی ہوتی ہے اور اس کی قوم کو جن چیلنجوں کا سامنا ہوتا ہے وہ ان پر بھی اظہار خیال کرتا ہے۔ اس قسم کے علمی و تحقیقی مقالات میں سوالات قائم کئے جاتے ہیں اور درپیش مسائل ومشکلات کا تذکرہ اس غرض سے کیا جاتا ہے تاکہ اس پر بحث ومناقشہ اور تبادلۂ خیالات ہوں اور اس کے نتیجہ میں امت کو ترقی سے ہمکنار کرنے والے عملی نسخے ومشورے سامنے آسکیں۔

اسی طرح کرنے کا ایک اور کام یہ ہے کہ اوقات کے تعین کے ساتھ ششماہی وسالانہ نظام عمل بنایا جائے، اس میں ان تمام کاموں کی نشاندہی کی جائے جو اس مقررہ مدت کے دوران کرنے ہیں اس میں تدریس، اشراف (رہنمائی)، انفرادی واجتماعی مقالات کی تیاری، علاوہ ازیں علمی کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت اور اخیر میں بعض ان پروگراموں میں شرکت جن کا انعقاد مساجد وغیرہ کے اندر معاشرتی مقاصد کے لئے ہوتا ہے، شامل ہوسکتے ہیں۔ معاشرہ میں مدرس کی سرگرمی کا اندازہ لگانے کے لئے ادارہ کی چہار دیواری کے باہر بھی تعلیم وتدریس کی سرگرمی ضروری ہے۔ اس کا التزام ہماری اس جامعہ میں کیا جاتا ہے جہاں ان دنوں میں تدریس کی خدمت انجام دے رہی ہوں۔ ادارہ سے باہر کے اس پروگرام کو ''معاشرتی خدمت'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ مدرس کو جانچنے اور پرکھنے کا عمل بھی انجام پاتا ہے۔ ان کے علاوہ

ششماہی وسالانہ نظام الاوقات کے تحت مدرس نے جن تحقیقی وتعلیمی وپروگرام اور سرگرمیوں میں حصہ لیا ہے ان کے ذریعہ وہ آگے بڑھنے کے اپنے طے شدہ منصوبہ کا جائزہ لیتا ہے۔ جن گوشوں میں اس کے اندر کمزوروں یا طاقت ہے اس کا اسے علم ہوتا ہے، ان کے اسباب کا اسے پتہ چلتا ہے، پھر وہ حسب خواہش ان میں تبدیلی لاتا ہے، اس طرح اس کی پوری عملی سرگرمی منظّم طور پر آگے بڑھتی ہے اور اس کی سرگرمیاں حالات وظروف اور ہاتھ میں آنے والے مواقع کے تابع نہیں ہوتیں۔ تخلیقی طرز فکر کا حامل وہ عمل ہے جو طے شدہ منصوبہ اور نظام الاوقات کے مطابق انجام پاتا ہے، چاہے یہ منصوبہ سازی کم مدت کے لئے کی گئی ہو یا زیادہ مدت کے لئے کی گئی ہو۔ چنانچہ ایسی منصوبہ بندی جو نظام الاوقات کی پابند ہوتی ہے اور مقاصد کے حصول کے لئے جب اس پر ایمانداری کے ساتھ عمل کیا جاتا ہے تو اس سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے جو کام کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہے اور پھر اس کے ذریعہ انسان تخلیقی عمل پر قدرت حاصل کر لیتا ہے۔

اسی طرح ایک مدرس کو تخلیقی طرز فکر کی مہارتیں نئے چیلنجوں اور درپیش مصائب وآفات کا سامنا کرنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ ایسا اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ مدرس ان قدیم کتابوں میں محصور ہو کر نہ رہ جائے جو اپنے زمانے کے تقاضوں اور مسائل اور اس دور کے لوگوں کے حالات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھیں۔ شرعی علوم کے مدرس سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے چیلنجوں اور انقلابات زمانہ کے ساتھ ساتھ چلے، اس لئے کہ ہر دور کا چیلنج مختلف ہوتا ہے اور بدلتے ہوئے حالات بھی ہر دور میں یکساں نہیں ہوتے لیکن ان چیلنجوں سے نمٹنے کا طریقہ اجتہادی عمل اور علم اصول فقہ کے استعمال سے ہاتھ آتا ہے اور اس راہ پر چل کر ہی شرعی احکام کے استخراج کے لئے نصوص وحی کے استعمال کے بنیادی منہج تک رسائی ہو پاتی ہے۔

پیچھے گزری ہوئی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ قاری اس حقیقت کو محسوس کر سکتے ہیں کہ میں نے معلم کے اندر تخلیقی صلاحیت کو پروان چڑھانے کے ممکنہ وسائل پر اپنی گفتگو مرکوز کی ہے، جس کا

تعلق اس کی اپنی ذات سے ہے۔ اس کے لئے کسی طرح کی عملی ٹریننگ اور مشق پر اسے مجبور کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تخلیقی صلاحیت کو ابھارنے پر گفتگو مختلف گوشوں پر مشتمل طویل گفتگو کا تقاضہ کرتی ہے اور تربیت وٹریننگ کے ماہرین ''معلم کے اندر تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے کے مجوزہ پروگرام'' (۱۲) پر روشنی ڈالتے وقت اسے زیر بحث لاتے ہیں۔ یہ چونکہ اس خاص فن میں مہارت رکھنے والوں کا میدان ہے، لہٰذا میں نے اس موضوع پر اشارہ کنایہ میں کوئی بات کہنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ میں نے اپنی گفتگو اس نکتہ پر مرکوز رکھی ہے کہ مدرس اپنی ذاتی توجہ ودلچسپی اور محنت سے کس طرح اپنے اندر تخلیقی صلاحیت پیدا کرسکتا ہے۔ فطری طور پر تخلیقی صلاحیت سے مالا مال مدرس ہی اس میں مہارت حاصل کر پاتا ہے۔ اسی طرح جب ایک مدرس کو اسلام اور مسلمانوں کو درپیش چیلنجوں کے سامنے ڈٹ جانے کا نمایاں طور پر اہل بنا دیا جائے گا تو اس کے بعد طلبہ کو اس مہم کے لئے تیار کرنا آسان ہوگا۔

جہاں تک طلبہ کے اندر تخلیقی طرز فکر سے دلچسپی پیدا کرنے کا سوال ہے تو اس کا انحصار مدرس اور طلبہ کے تعلقات کے اوپر ہے۔ اس حقیقت پر نگاہ ضروری ہے کہ جامعہ سطح کا مدرس طلبہ کی علمی نشو نما کرنے والا آخری استاذ ہوتا ہے۔ طالب علم ابتدائی تعلیم کے اپنے استاذ سے جدا ہوکر جامعہ سطح کے استاذ کے پاس پہنچتا ہے۔ اسی طرح ابتدائی تعلیم کی درسگاہ اور جامعہ دونوں کے اہداف الگ ہوا کرتے ہیں۔ اور چونکہ ''جامعہ سطح کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کو علمی بحث وتحقیق کے بنیادی مراکز کے طور پر دیکھا جاتا ہے اس لئے ان اعلیٰ تعلیمی اداروں کے مدرسین پر علم کی امانت کی تبلیغ، تعلیم اور نشر واشاعت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مدرسین کو علم کی اس امانت کو طلبہ تک پہنچانے کی ذمہ داری اس طور پر ادا کرنی چاہئے کہ وہ ان کے اندر تخلیقی صلاحیت بھی پیدا کریں اور انہیں پیداواری صلاحیت سے مالا مال بھی بنائیں'' (۱۳)۔ لہٰذا جامعہ کے استاذ کے لئے ضروری ہے کہ تمام ضروری امور کا

خیال رکھے اور تمام ممکنہ طریقوں کو بروئے کار لا کر ایسا طالب علم معاشرہ کو دے جس کے سینہ میں علم کا ذخیرہ موجود ہو اور اس کے مختلف گوشوں کا بھی وہ احاطہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ تخلیقیت کے اسلحہ سے لیس ہو، صرف حفظ و یادداشت پر اس کا بھروسہ نہ ہو، اس مدرس کا یہ بھی کام ہے کہ وہ منفی ذہنیت کے حامل طالب علم کو مثبت ذہنیت کے حامل متحرک طالب علم میں تبدیل کردے۔ یہ کام دوران درس سوال اور مناقشہ کے عمل کو بروئے کار لا کر، درس کے عمل میں طالب علم کی شرکت کو یقینی بنا کر اور افادیت کے حامل سوالات کرنے پر اسے ابھار کر کیا جاسکتا ہے۔

یہاں ہم خود اپنا ایک تجربہ بطور مثال بیان کرنا چاہتے ہیں۔ مادۂ فقہ مقارن جسے بیشتر طلبہ پسند نہیں کرتے ہیں، کی تدریس کے وقت مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس مادۂ فقہ مقارن کو طلبہ پسند کیوں نہیں کرتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مادہ میں مختلف فقہی مسالک کے بہت سے دلائل کو یاد کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایک مسلک کی طرف سے حدیث نبوی سے دلیل دی جاتی ہے جسے دوسرے مسلک والے کسی دوسری حدیث نبوی کے ذریعہ کالعدم قرار دیتے ہیں۔ اس صورتحال کی وجہ سے طالب علم اپنے کو ایک ایسے میدان جنگ میں پاتا ہے جس میں وحی کے نصوص کی تلواریں ہی ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہوتی ہیں۔ اس مادۂ فقہ مقارن کی تدریس کے وقت مدرس کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ اسے فریق مخالف کے دلائل پر تنقیدی غور وفکر کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے استعمال کرے۔ اس کا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ مضبوط دلائل کا جائزہ لیتے ہوئے اور کمزور دلائل کو کالعدم قرار دینے کی غرض سے زیادہ مضبوط دلیل کو تنقیدی شعور کے ساتھ سامنے لایا جائے تاکہ فقہ مقارن کی ضخیم کتابوں اور چھوٹے مجموعوں سے کما حقہ استفادہ ممکن ہوسکے۔ اس مادۂ فقہ مقارن کو مذکورہ طریقہ سے پڑھانے سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوگا کہ اس سے شریعت اسلامی کی بلند حیثیت اور ایک دینی مسئلہ میں متعدد فقہی آراء کی وجہ سے اس کا طرۂ امتیاز اجاگر ہو کر سامنے آئے گا۔ اس کا اصل فائدہ

اس وقت سامنے آتا ہے جب کسی اصل حکم شرعی پر عمل دشوار ہو جاتا ہے تو اس حکم شرعی میں متعدد فقہی آراء کی موجودگی کی وجہ سے کسی ایک رائے پر عمل کر کے انسان تنگی و پریشانی کی صورتحال سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اس مادۂ فقہ مقارن کا ایک تربیتی پہلو بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، وہ تربیتی پہلو یہ ہے کہ طالب علم اس مادہ کو پڑھتے ہوئے تقلید اور مسلکی تعصب کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکتا ہے، یہ بلندئ اخلاق کی بات ہے جس کا فائدہ اسے حاصل ہوتا ہے۔ مدرس کا کام طالب علم کو صرف علم و معرفت سے آراستہ کرنا نہیں ہے بلکہ وہ اس کے ساتھ ہی طالب کے اندر بلند اخلاق اور پسندیدہ عادات وصفات اور مثبت کردار و عمل کی بھی تخم ریزی کرتا ہے۔ جامعہ کے اندر اس طرح کی اچھی تربیت حاصل کرنے کا طالب علم کے پاس آخری موقع ہوتا ہے جس کا آغاز اس نے اپنے گھر میں شیر خواری کے مرحلہ میں کی ہوتی ہے۔ جامعہ کے مدرس پر تعلیم و تربیت سے جڑے اس اہم مسئلہ کا ادراک لازمی ہے اور اس کی طرف توجہ دینا بھی اس کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ معاشرہ کے لئے ایسے افراد پیدا کر سکے جو پہلے تو اپنے اخلاق و کردار کے اعتبار سے نیک و صالح اور متحرک ہو پھر دوسرے نمبر پر وہ اجتہادی بصیرت سے مالا مال ایک مجتہد ہو۔ مدرس نے تدریس کے لئے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کے ذریعہ وہ کس حد تک طلبہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے میں کامیاب ہے اس پر نگاہ رکھنا انتہائی ضروری ہے، کیونکہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ استاذ کرسی پر جم کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے اوراق کی مدد سے سبق کی تشریح و توضیح کرتا جاتا ہے یا اپنے سامنے کھلی ہوئی کتاب کے اوراق پلٹ کر اور اس میں غور و فکر کر کے طلبہ کے سامنے سبق کو پیش کرتا ہے۔ اس روایتی طریقۂ تدریس کو اپنانے کی وجہ سے طلبہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو اونگھتے رہتے ہیں یا اپنی کرسی پر پہلو بدل بدل کر بیٹھتے ہیں یا کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں بناتے رہتے ہیں۔ شرعی علوم کی تدریس کا یہ روایتی طریقہ ہے جسے سبق کی تلقین کا طریقہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں سبق کی تلقین و تکرار پر انحصار ہوتا ہے۔ اس طریقہ

کو اختیار کر کے طالب علم اپنے دل و دماغ میں یا تحریری طور پر سبق کا احاطہ اور اس کو محفوظ کرنے کا کام تو کر لیتا ہے لیکن جب اس سے اس سبق کا کوئی حصہ دہرانے کے لئے کہا جاتا ہے یا اس سے زیر بحث مسائل میں سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا ہے تو طالب علم کے لئے جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طریقۂ تدریس کے ساتھ بعض منفی صورتحال بھی جڑی ہوئی ہے، مثلاً طلبہ کے درمیان انفرادی فرق و امتیاز کی رعایت بسا اوقات مشکل ہوتی ہے کیونکہ طلبہ کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ انفرادی طور پر ہر ایک کی طرف توجہ دینا دشوار ہوتا ہے۔ اس طریقۂ تدریس کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ اس میں طلبہ سے سوال و جواب نہیں ہوتا کیونکہ وہ صرف سبق کو سنتے ہیں۔ کوئی سوال کرنے کے لئے یا کسی اشکال کو حل کرنے کے لئے نہ انہیں ابھارا جاتا ہے اور نہ ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ اس طریقۂ تدریس کو اختیار کر کے اس دور میں مدرس ان کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ آج کے دور میں عام طور پر طلبہ کا ذہن خارج درس امور میں مشغول رہتا ہے۔ زیر نظر درس پر عبور حاصل کرنا اب اس کا ہدف و مقصد نہیں رہ گیا ہے۔ آج کے دور میں طلبہ پڑھنے کے لئے جبراً اداروں کا رخ کرتے ہیں، کیونکہ تعلیم ہر ہر فرد کے لئے اجباری کر دی گئی ہے۔ اسی وجہ سے طالب علم جب کلاس میں پہنچتا ہے تو اس کا ذہن و دماغ اس کے ذوق و مزاج کی ایسی چیزوں میں الجھا رہتا ہے جس کی تکمیل اس اکتاہٹ پیدا کرنے والے درس سے نہیں ہو سکتی ہے۔ یہاں پر رُک کر روز بروز طلبہ کے اندر حصول علم کے شوق میں کمی اور ان کے سرد پڑتے ہوئے جذبہ پر گفتگو کرنا ضروری ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو ماہرین تعلیم اور ذمہ داروں کے لئے الجھن کا باعث بنا ہوا ہے اور یہ موضوع ایک مستقل تربیتی بحث و مباحثہ اور تحقیق کا متقاضی ہے، جب ہمیں یہ علم ہو گیا کہ اس دور میں تلقین درس کا طریقہ نفع بخش نہیں ہے، کیونکہ یہ دور سائنس و ٹکنالوجی اور ہر معاملہ میں سرعت پسندی کا دور ہے، اس دور میں سبق کو نفع بخش بنانے کے لئے طریقۂ تدریس میں تنوع اور جدت پیدا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس کے لئے

دوسرے ایسے طریقوں کو اختیار کرنا بھی ضروری ہے جن کے ذریعہ تدریس کو مؤثر اور طالب علم کو اس عمل میں باقاعدہ طور پر شریک کیا جاسکتا ہو، مثلاً تدریس کے لئے سائنسی تکنیک کا استعمال، اس کے ذریعہ تدریس کے عمل میں زندگی کی روح پھونکی جاسکتی ہے اور طلبہ کی زیادہ سے زیادہ توجہ ودلچسپی درس کی طرف مبذول کی جاسکتی ہے۔ سائنسی تکنیک کا استعمال کرکے مدرس بہت ساری معلومات کو تھوڑی سی جگہ میں تفصیل ووضاحت کے ساتھ دلچسپ انداز میں جمع کرنے پر آسانی سے قادر ہوسکتا ہے۔ اس کی وجہ سے طلبہ کی توجہ بھی ہر وقت درس کی طرف مبذول رہے گی۔ تدرس کے لئے ان سائنسی آلات ووسائل کے استعمال کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ بقول ڈاکٹر احمد محمد زکی (ماہر شعبۂ تکنین): ''اس کا استعمال درس کے تئیں طالب علم کے اندر توجہ ودلچسپی پیدا کرنے اور حصول علم کے لئے اس کی پیاس بجھانے کے لئے کیا جاسکتا ہے۔ یہ سائنسی آلات ووسائل متعلم کے تمام حواس کو مشغول رکھتے ہیں جو معلومات کو منظّم انداز میں طالب کے ذہن میں بٹھانے میں مدد دیتے ہیں۔ اور اسے مسلسل اپنی فکری صلاحیت کے استعمال پر مجبور کرتے ہیں۔ طالب کے اندر باریکی سے کسی چیز کا مشاہدہ کرنے اور دیر تک غور وفکر کرنے کی قدرت پیدا کرتے ہیں اور سائنٹفک انداز میں غور وفکر کے طریقے اختیار کرنے پر انہیں آمادہ کرتے ہیں'' (۱۴)۔

علاوہ ازیں تدریس میں سائنسی تکنیک کا استعمال کرکے پورے درس کا احاطہ کرنا بھی آسان ہوگا، کیونکہ تصاویر کا استعمال کرکے آسانی کے ساتھ درس کے مشتملات کی تشریح ووضاحت کی جاسکتی ہے مثلاً مناسک حج کے مقامات، فقہ سیرت کے اسباق اور غزوات کے خطوں اور علاقوں کا مطالعہ اس مقصد کے لئے تیار کئے گئے نقشوں کی مدد سے آسانی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے، اس پس منظر میں طالب علم نقشہ کو سامنے رکھ کر اس پر غور وفکر کرکے مکہ اور مدینہ کے درمیان کی مسافت اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے راستہ کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تو اسکے لئے اس سبق کو سمجھنا اور اس کا احاطہ کرنا آسان ہوجائے گا۔ سائنسی تکنیک زکاۃ کی مقدار

اور اس سے متعلق حساب و کتاب کو سمجھانے میں بھی اہم رول ادا کرسکتی ہے، خاص طور پر اس جدید دور میں نئی نئی چیزوں میں زکاۃ کے جو مسائل سامنے آئے ہیں انہیں اچھی طرح سمجھنے اور حل کرنے کے لئے سائنسی تکنیک سے مدد لی جاسکتی ہے، مثلاً شیرز کا نصاب زکاۃ، تجارتی بونڈ اور عام سامان تجارت کی زکاۃ سے متعلق معاملات کو اس کے ذریعہ بہتر طور پر حل کیا جاسکتا ہے نیز حساب و کتاب کے آسان سائنٹفک طریقہ کو استعمال کر کے علم وراثت میں وارثین کے حصول کو بہتر طور پر سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے۔

دس سے پندرہ تک کی تعداد پر مشتمل طلبہ کو پڑھانے کے لئے مناقشہ کا سہارا لینا تدریس کا سب سے بہتر طریقہ مانا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں سبق کا محور کوئی ایسا موضوع ہوتا ہے جس پر مدرس اور طلبہ کے درمیان بحث ومباحثہ ہوتا ہے۔ اس میں خارج درس کی بعض معاون کتابوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے جو طلبہ کی فکری صلاحیت کو ابھارنے اور انہیں سوالات کرنے پر آمادہ کرنے میں مددگار بن سکتی ہے۔ یہ تدریس کا ایک ایسا طریقہ ہے جو موضوع کو متعدد طریقوں سے سمجھنے میں معاون بنتا ہے اور اس طرح سبق کا احاطہ کرنے کی طالب علم کی قدرت وصلاحیت بھی پروان چڑھتی ہے، اسی طرح کلاس کی اندرونی سرگرمیوں میں تنوع پیدا کر کے بھی تدریس کو کامیاب اور بامقصد بنایا جاسکتا ہے، اسی کے لئے مدرس کلاس کی بوجھل فضا میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے کوئی سوال سامنے لاتا ہے یا کسی مسئلہ پر طالب علم کو بحث ومباحثہ کی دعوت دیتا ہے یا اس سے تختۂ سیاہ پر کچھ لکھواتا ہے یا کسی موضوع پر شجرہ بنوانے کا طریقہ استعمال کرتا ہے۔ مدرس کے لئے بسا اوقات یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہنسنے ہنسانے کے فن سے بھی واقف ہوتا ہو تاکہ ہنسی مذاق کی کوئی بات کہہ کے طلبہ کی خاموشی وسنجیدگی کی فضا میں ہلچل اور حرکت پیدا کردے لیکن ان سب کے ساتھ ہر وقت سبق کے اہم نکتوں پر طلبہ کی توجہ کو مرکوز رکھنا اور سبق سے متعلق اہم معلومات کو طلبہ کے لئے ایک لڑی میں پروکر رکھنا ضروری ہوتا ہے تاکہ طالب علم درس کی

فروعی باتوں میں الجھ کر اس کے جوہر مغز سے فارغ نہ ہو جائے۔

ایک مادہ کی نصابی معلومات کو ایک دوسرے سے مربوط رکھنے کے لئے یا کئی مختلف مادے کی معلومات کو باہم مربوط رکھنے کے لئے یونٹس (اکائیوں) کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے لیکن ان سب کا نظریاتی مقصد ایک ہی ہوتا ہے، مثال کے طور پر اگر زکاۃ کی بحث کو ایک الگ مادے کے طور پر پڑھایا جائے تو یہ طریقہ ایک خشک اور مضمحل کر دینے والا طریقہ ثابت ہوگا، اس میں صرف زکاۃ کے وجوب کے اوقات اور اس کے نصاب ومصارف سے متعلق گوشے شامل ہوسکیں گے، لیکن اگر اس زکاۃ کی بحث کو ایک یونٹ کے طور پر پڑھایا جائے تو اسے زیادہ طاقتور اور مؤثر انداز میں پڑھایا جاسکتا ہے اور اس میں مادے سے متعلق متعدد موضوعات شامل ہو سکتے ہیں، مثلاً زکاۃ اور معاشرہ میں فقر وفاقہ کی صورتحال، زکاۃ اور اقتصادی نظم وضبط، زکاۃ اور باہمی تعاون اور زکاۃ کی عدم ادائیگی کی دو چند مضرتیں اور نقصانات وغیرہ۔

اسی طرح کسی مبحث کو مثالوں سے سمجھانے کا اثر معاشرہ کی نئی موجودہ صورتحال کے تناظر میں طالب علم کے ذہن پر کس طرح مرتب ہو رہا ہے، اس پر نگاہ رکھنا بھی بہت ضروری ہے، اس لئے کہ معاشرہ کی حرکت وسرگرمی اور حقیقی معاشرتی صورتحال کسی ایک شکل وہیئت پر باقی نہیں رہتی ہے بلکہ اس میں حرکت وتبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ یہ معاشرتی صورتحال کبھی اخذ احکام کے لئے اسلامی شریعت کی طرف رجوع کرتی ہے اور کبھی یہ اسلامی شریعت سے بالکل دور ہو کر رہ جاتی ہے تاکہ نئے افکار ونظریات کے دھارے کے ساتھ بہنا شروع کر دے۔ استاذ صرف مقررہ نصاب کو پڑھانے پر توجہ دیتے ہیں۔ اس وقت کی موجودہ صورتحال کیا ہے، عام طور پر اس سے استاذ کو کوئی سروکار نہیں ہوتا، اس کی وجہ سے طالب علم کو ایک بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اس کے لئے استاذ کے پڑھائے ہوئے سبق اور موجودہ معاشرتی صورتحال کے درمیان امتیاز وفرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے، کیونکہ دونوں دو مخالف سمتوں میں اسے چلتے ہوئے نظر آتے

ہیں۔ لہٰذا مدرس کے لئے یہاں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے زیر تدریس مادہ کو زندگی کی موجودہ صورتحال سے مربوط کرے اور اس کے لئے شرعی احکام کی صحیح جگہوں کو سمجھے اور انہیں ان کی اصل جگہوں پر رکھے، کیونکہ انسان کی حقیقی صورتحال احکام شرعیہ کو صحیح تناظر میں سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کا ایک عنصر ہوتی ہے۔ اسی طرح مدرس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بعض شرعی نصوص کو سمجھنے اور اس کی توضیح کے لئے جدید علوم سے استفادہ کی کوشش کرے اور شرعی وفقہی فکر ونظر کا سہارا لے کر جدید چیلنجوں اور نئے مسائل کے حل کی کوشش کرے، (خاص طور پر طب، سیاست اور اقتصادی معاملات کے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہے)۔ نئی معاشرتی صورتحال سے لے کر اس کے چیلنجوں وغیرہ کا شرعی حل ڈھونڈنے میں یہ طریقۂ تدریس طالب علم اور استاذ دونوں کو معاشر کا ایک حصہ بننے اور اس کے اداروں میں مکمل شمولیت اختیار کرنے میں مدد دے گا۔ استاذ کو چاہئے کہ وہ امت کی تعمیر وترقی میں اس طریقۂ تدریس کی اہمیت کی وضاحت کرے اور طالب علم کو معاشرہ کا ایک متحرک فرد بننے پر ابھارے تاکہ معاشرہ کی موجودہ صورتحال سے طالب علم کا کنارہ کشی اختیار کرنا ممکن نہ ہو سکے۔ خاص اس تناظر میں کہ شرعی علوم کا جو موجودہ نصاب قرآن وسنت سے مستنبط احکام کو صرف نظریاتی طور پر پیش کرنے پر انحصار کرتا ہے اور ان شرعی احکام کی جو خلاف ورزیاں معاشرہ میں ہر سو نظر آ رہی ہیں ان سے ان احکام کو جوڑنے کی کوشش نہیں کرتا ہے اور نہ ہی ان شرعی احکام کی مخالفتوں کی جدید شکلوں کو زیر بحث لایا جاتا ہے، تاکہ ان کی شرعی حیثیت واصلیت کو واضح کیا جا سکے اور صرف قدیم فقہی وفروعی مثالوں کو پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، طالب علم کے لئے جس کا سامنا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح طالب علم نہ تو درس کو سمجھ پاتا ہے اور نہ ہی اس فقہی قاعدہ کو سمجھ پاتا ہے جس کے اوپر اس مسئلہ میں انحصار کیا گیا ہے حالانکہ مثال کا ایک عمومی فائدہ تو یہی ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ درس کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

یہاں موجودہ زمانہ کی مناسبت سے ان مثالوں کے علاوہ جو پیچھے گزر چکی ہیں بہت سی

نئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، یہ مثالیں فقہ معاصر اور مادہ فقہ مقارن سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہاں پر ہم فقہ معاملات سے چند مثالوں کا ذکر کررہے ہیں، مثلاً دھوکہ وفریب کے امکان کی وجہ سے خرید وفروخت کی جن شکلوں کی ممانعت ہے اس سے متعلق سبق کی تشریح کرتے ہوئے ہم یہ مثال دے سکتے ہیں کہ ''بدکنے اور بھاگنے والے اونٹ، بھگوڑے غلام، نہر میں تیرتی ہوئی مچھلی، آسمان میں اڑتے ہوئے پرندے اور تھن میں موجودہ دودھ کی بیع جائز نہیں ہے''۔ اس کے علاوہ بھی اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جن میں صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اس پر اصول فقہ کے درس کی مثالوں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ آج بھی ویسی ہی ہیں جیسی میں نے جامعہ میں انہیں پڑھا تھا اور جیسی میں آج اپنے طلبہ کو پڑھا رہی ہوں اور جیسی میرے طلبہ مستقبل میں اپنے طلبہ کو پڑھائیں گے۔ استاذ کے لئے نئی معاشرتی صورتحال سے تعلق رکھنے والی مثالوں اور تطبیقات کو ہمہ وقت ذہن میں متحضر رکھنا مشکل ہوتا ہے، اس لئے کہ خود استاذ کے لئے یہ کام انتہائی مشکل ہے کہ وہ درس کا احاطہ کرنے کے بعد نظریہ وتھیوری کو عملی مشق کے ساتھ ملانے کی کامیاب کوشش کرے۔ اصول فقہ کے درس میں جدت کی مثال یہ ہوسکتی ہے کہ اصول فقہ کے درس کو موجودہ حقیقی صورتحال سے مربوط کیا جائے، اس لئے کہ شرعی احکام کی صحیح جگہوں کو سمجھنے کے بعد ان کی اصل جگہوں پر انہیں رکھا جائے کیونکہ حقیقی صورتحال کو شرعی احکام کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کا ایک عنصر سمجھا جاتا ہے اور بعض شرعی نصوص کے فہم اور ان کی توضیح کے لئے علوم جدیدہ سے استفادہ کا اسے ایک ذریعہ تصور کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ منہج معاشرہ کا ایک حصہ بن جانے اور اس کے اداروں میں ضم ہوجانے میں مدد دیتا ہے۔ ایسا ہونے پر اصول کی تعلیم دینے والے اساتذہ صرف ان نظریاتی مباحث میں محدود ہوکر نہیں رہتے جنہیں علم کلام اور فلسفہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اصول فقہ کے منہج کو ہم اپنی زندگی کی موجودہ صورتحال سے علاحدہ بھی رکھ سکتے ہیں کیونکہ اصول فقہ کے موجودہ مباحث اگرچہ اپنی ذات اور حقیقت کے اعتبار سے قدیم

ہیں اوران کی تدریس میں قدیم مثالوں ہی پر انحصار کیا گیا ہے، جن میں نہ تو ماضی میں تبدیلی واقع ہوئی تھی اور نہ آنے والے زمانہ میں تبدیلی ہوگی۔ اصول فقہ کی چاہے جس قدیم یا جدید کتاب کو اٹھا لیجئے آپ کو یہی کیفیت نظر آئے گی، اس کے لئے آپ چند مثالوں پر غور کریں: ''السبب'' سے متعلق بحث میں آپ کو ہر کتاب میں یہ مثال مل جائے گی کہ ''قتل عمد'' (جان بوجہ کر قتل کرنا) قصاص کا سبب ہے۔ ''الاجماع'' کے سبق میں یہ مثال ملے گی کہ دادی کو وراثت میں چھٹا حصہ دینا ان مسائل میں سے ہے جن پر سب کا اتفاق ہے۔ ''رخصت وعزیمت'' کے سبق میں واجب کو ترک کرنے کے جائز ہونے کی یہ مثال مل جائے گی کہ ''رمضان میں مسافر کے لئے روزہ رکھنا درست ہے''۔ اس صورتحال کے پس منظر میں علم اصول فقہ اور اس کے ضمنی مباحث سے متعلق درسی نصاب تعلیم پر نظر ثانی ناگزیر نظر آتی ہے تاکہ نئے مسائل کو اس میں شامل کیا جائے اور اس کے ذریعہ دشمنانِ دین کی طرف سے درپیش چیلنجوں اور ان کے پیدا کردہ نئے شکوک وشبہات کا بہتر طور پر جواب دیا جاسکے۔ اگر ہر موضوع پر نئی مثالوں کو شامل کرنا اور موجودہ عدالتی نظام کے تحت اس کی تنفیذ ممکن ہو تو یہ اور بہتر ہوگا۔

''فقہی قواعد وضوابط'' کی مثالیں بھی فقہ کے موضوع سے تعلق رکھنے والی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ ان اہم ترین علوم میں سے ہے جس میں ہمارے علماء نے اپنی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ امام قرافی کا قول ہے: ''فقہی قواعد وضوابط کے مجموعے کثیر تعداد میں ہیں اور مسائل کے حل میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے، ان کا بہت بڑا حصہ شریعت کے اسرار ورموز پر مشتمل ہے۔ ان فقہی قواعد کے فوائد ومنافع بھی بے شمار ہیں اور فقیہ جتنا زیادہ ان کا احاطہ کرنے پر قادر ہوتا ہے اتنا ہی اس کے شرف ومرتبہ میں اضافہ ہوتا ہے'' (۱۶)۔

اس کی بنیاد فقہاء کی اس جدوجہد پر قائم ہے جو انہوں نے بکھری ہوئی فقہی فروعات کو ایک متعین ضابطہ کے تحت جمع کرنے کے لئے کی ہے، تاکہ بہت ساری ایک جیسی فقہی

فروعات کوایک دوسرے سے مربوط کرنے اور دوسری بعض فروعات کے ساتھ انہیں پیش کرنے کا ذریعہ وجود میں آئے۔ امام سیوطی نے فقہاء کی تعریف کرنے کے بعد کہا ہے: ''فقہاء نے فقہ میں نوع بنوع فنون اور اقسام پیدا کئے اور اس کے استنباط میں ایک طویل مسافت طے کی۔ فقہ کی چند اہم ترین اقسام یہ ہیں: فروعات اور مشابہات کے نظائر کا علم، مفردات کو ان کی ہم جنسوں اور ہم شکلوں سے جوڑنا۔ میں یہ بات قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ فن صرف تمنا و آرزو کرنے اور ٹال مٹول کا رویہ اپنانے سے حاصل نہیں ہوسکتا ہے'' (۱۷)۔ صورتحال یہ ہے کہ اس دور میں مدرسین کے لئے نئی مثالیں تلاش کرنا مشکل ہوجاتا ہے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ وہ نئی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہیں، اس لئے کہ وہ زمانہ کی نئی چیزوں سے افسوسناک حد تک ناواقف ہیں۔ یہ نئی نئی چیزیں عام طور پر علمی تحقیقات، مجلّات میں شائع ہونے والے علمی مقالات میں اور انٹرنیٹ وغیرہ پر دستیاب ہوتی ہیں جہاں تک رسائی کے لئے تلاش وجستجو کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ قدیم علماء نے اپنے دور کے مسائل وآفات کا دقت نظر سے جائزہ لیا تھا۔ یہاں پہنچ کر استاذ اہم فقہی قاعدوں کی تشریح کرنے کے بجائے طلبہ کی ذہنی سطح سے بلند اور مشکل تر مثالوں کی تشریح کرنے لگتا ہے۔ طلبہ کے لئے یہ مثالیں مشکل اس لئے ہوتی ہیں کہ وہ ان کے زمانہ سے تعلق نہیں رکھتی ہیں۔ ایسی صورتحال میں اس مادہ کا کیا فائدہ باقی رہ جاتا ہے جس کا مجموعی وانفرادی وجود اور طلبہ کو اس کا درس دینے کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہ ان کے اندر فقہی صلاحیت پیدا کرنے میں معاون ہوگا۔ اس علم فقہ کے وجود کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے، لیکن زیر بحث صورتحال میں معاملہ الٹا ہوکر رہ جاتا ہے، کیونکہ طالب علم اس قدیم مثالوں کا احاطہ کرنے میں ناکام رہتا ہے اور نہ ہی اسے اس کا اصل قاعدہ ہی معلوم ہو پاتا ہے۔

آج کے دور میں مدرسین اپنے زیر تدریس مادہ کی عملی تطبیق کے لئے مناسب طور پر کوشش ومحنت نہیں کر پاتے ہیں، اس لئے کہ وہ خود مدرسہ یا جامعہ کی اپنی تعلیم کے دوران عملی تطبیق

سے نہ گزرنے کی وجہ سے اس کے علم سے محروم ہوتے ہیں۔اس کے لئے معلمین کو تدریس کے ساتھ عملی تطبیق کے لئے اضافی محنت کرنا ناگزیر ہے اور یہ وقت وحالات کا تقاضہ بھی ہے تا کہ زیر تدریس کتابوں میں پائے جانے والے جمود کو توڑا جاسکے اور تعلیم کو رٹانے اور یاد کرانے کے مرحلہ سے نکال کر عملی مشق کرانے اور افہام وتفہیم کے ذریعہ دل ودماغ میں اتارنے کے مرحلہ تک پہنچایا جاسکے(۱۸)۔ان ملاحظات کے بعد نصاب تعلیم پر نظر ثانی اور نئے فقہی، حدیثی اور تفسیری مسائل کو اس میں شامل کرنے کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے تا کہ ہر لمحہ نئے انداز سے پیدا کئے جانے والے شکوک وشبہات اور زمانہ کے نئے نئے چیلنجوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔یہ کام اسی وقت مشکل نہیں ہوگا جب شرعی علوم کے ہر گوشہ سے تعلق رکھنے والے محققین نئے مسائل اور ان کے دلائل کو سامنے لانے کی غرض سے مل جل کر کوشش کریں۔زمانہ کے ان نئے مسائل اور ان کے دلائل کا انحصار اکثر وبیشتر مقاصد شریعت، فقہی قواعد اور آیات واحادیث کی بامقصد تشریح وتوضیح پر ہوتا ہے۔اس کے ذریعہ علمی بحث وتحقیق اور شرعی علوم کے نصاب تعلیم کو زیادہ ترقی یافتہ شکل دینے میں مدد ملے گی۔

علمی بحث وتحقیق اور غور وفکر پر طالب علم کو ابھارنے کے جو ممکنہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں ان پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔طالب علم جب سبق کو سننے کے بعد اسے اچھی طرح سمجھ کر یاد کر لیتا ہے تب ہم سوال واستفسار کا ملکہ اس کے اندر پیدا کرنے کی طرف قدم بڑھاتے ہیں، تا کہ مناقشہ اور متنوع مثالوں سے سبق اسے بہت اچھی طرح سمجھ میں آجائے، کیونکہ جو معلومات اسے حاصل ہوئی ہیں اگر وہ تجزیہ اور زبانی طور پر دہرائے بغیر باقی رہ جاتی ہیں تو اس کی حیثیت ایک بے جان ڈھانچہ کی ہوگی اور طالب علم کو اس کا فائدہ صرف یہ ہوگا کہ وہ اس غیر مفید سبق کا بوجھ ڈھوئے یا اسے دہرانے کے لئے کہا جائے تو دہرادے۔تنقیدی انداز میں غور وفکر معلومات کو ایک تخلیقی طاقت میں تبدیل کر دیتا ہے جس سے روشنی اور علمی عقل وفکر کی تشکیل میں مدد ملتی ہے اور اس صلاحیت وخوبی کا حامل بن جانے کے بعد انسان گردوپیش کے انفرادی واقعات اور زندگی کے

تقاضوں کے ساتھ نرمی وآسانی کے ساتھ معاملہ کرنے پر قادر ہوجاتا ہے۔اسے تجزیہ کرنے ،نتیجہ نکالنے اور کسی چیز کو سمجھنے اور اس کا احاطہ کرنے کی قدرت حاصل ہوجاتی ہے جو انسان کو ترقی یافتہ زندگی کے معیار تک پہنچنے اور زمانہ کے مطابق معاملہ و برتاؤ کرنے میں مدد دیتی ہے(۱۹)۔عموماً تعلیم وتربیت کے یہی متوقع مقاصد بھی ہیں۔'' اس میں شک نہیں کہ تدریس کا مطلوبہ ہدف یہ نہیں ہے کہ طلبہ کے ذہنوں کو معلومات سے بھر دیا جائے ،اگر چہ وہ معلومات اپنے آپ میں مفید و بامقصد کیوں نہ ہوں،طلبہ کو فقہ کی تعلیم دینے کا حقیقی مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے ذہن ودماغ کو فقہ کی تمام معلومات سے بھر لیں بلکہ فقہ کی تدریس کا اصل مقصد طالب علم کی فقہی شخصیت کی تعمیر اور اس کے اندر فقہی بحث وتحقیق اور مسائل کے استنباط کا ملکہ پیدا کرنا ہے اور لغزشوں سے پاک علمی غور وفکر کی قدرت سے اسے مالا مال کرنا ہے، جو غور وفکر واضح فقہی منہج پر مبنی ہو اور اس مرحلہ سے گزرنے کے بعد اسے کسی مسئلہ پر گفتگو اور مناظرہ کی قدرت حاصل ہوجائے''(۲۰)۔

آج کے دور کے چیلنج اور ہر روز رونما ہونے والی تبدیلیاں بہت زیادہ بھی ہیں اور پیچیدہ بھی ،لہذا دوران تدریس عقلی استدلال سے طالب علم کے ذہن ودماغ سے تاریکی اور الجھن کا خاتمہ ہوتا ہے۔شرعی علوم کی تدریس کے تعلق سے یہ بات زمانہ قدیم سے معروف ہے۔اس میں صرف قرآن وسنت کے نصوص ہی کو اصل وبنیاد بنایا جاتا ہے اور اس میں عقلی استدلال برائے نام ہی ہوتا ہے جسے طالب علم آسانی سے سمجھ بھی نہیں پاتا ہے۔اس صورتحال میں نص سے استدلال کے بعد عقلی دلیل سے استدلال غایت درجہ اہمیت کا حامل ہے۔طالب علم کو اس کی تعلیم دینا اس لئے بھی بہت اہم ہے کہ'' روز بروز عقلی وفکری شکوک وشبہات میں اضافہ کی وجہ سے شرعی علوم کی تدریس کے وقت پوری توجہ وانہماک کے ساتھ عقلی استدلال کی طرف توجہ دینا ضروری ہوگیا ہے''(۲۱)۔طالب علم کے اندر تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ معاون جو چیز بنتی ہے وہ ہے مدرس کا دوران تدریس زیادہ سے زیادہ سوالات کرنا اور اس کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ

درس کے آغاز ہی میں زیر تدریس سبق کے تعلق سے یکے بعد دیگرے متعدد سوالات ہونے چاہئیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو سوالات کئے گئے ہیں ان سب کے جوابات فوراً ہی یا دوران درس ضروری طور پر دئے جائیں۔ ڈاکٹر جمال باؤنے جسے ''کثرت سے مثالیں پیش کرنے کا اسلوب''۔(۲۲) قرار دیا ہے اسے تدریس میں بڑے پیمانہ پر رواج دینا ضروری ہے۔

ان باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم طلبہ کو سوال کرنے کا طریقہ سکھائیں اور بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر سوال کرنے کے ذریعہ مطلوبہ معلومات تک رسائی حاصل کرنے کے طریقہ سے انہیں واقف کرائیں۔ ماہرین تربیت جسے'' طلبہ کی پوشیدہ صلاحیت کو ابھار کر جدت پیدا کرنے کا نام دیتے ہیں، ہم اسے بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ اس میں مدرس ابھارنے اور متوجہ کرنے والی بعض مختصر تعلیقات کو پیش کر کے طلبہ کی خوابیدہ صلاحیت کو بیدار کر سکتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ نئے افکار و آراء کو سامنے لایا جا سکے''۔(۲۳)

اس کام کو کرنے کے بعد ایک مدرس کا رول اس طور پر مزید اہم ہو جاتا ہے کہ وہ بیک وقت مدرس کے ساتھ مدرب (تربی دینے والا)، مراقب (نگرانی کرنے والا) اور مستشار (صلاح کار) بھی بن جاتا ہے۔ پھر اس مدرس کا رول صرف طلبہ کو معلومات فراہم کرنے تک محدود نہیں رہ جاتا ہے بلکہ وہ ان معلومات تک صحیح طریقہ سے پہنچنے میں طلباء کی رہنمائی کرتا ہے اور صحیح رخ اختیار کرنے میں اس کی نگرانی کرتا ہے اور اس کے اندر سوالات کرنے کی روح پھونکنے میں اسے تربیت دیتا ہے اور اس کام کے لئے اس کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ کسی موضوع کو ایسے سوالات کے ذریعہ پیش کیا جائے جو طلبہ کی توجہ و دلچسپی کو اپنی طرف مبذول کرے تا کہ شرعی علوم کی تدریس کے اہداف بطریق احسن پورے ہوں اور انہیں معلم کے ساتھ مل کر اس مشکل مسئلہ کو حل کرنے کا مناسب موقع حاصل ہو سکے(۲۴)۔

عملی طور پر طالب علم کے اندر لیاقت و اہلیت پیدا کرنے کی غرض سے مدرس کو اس نکتہ کو

سمجھنے کی ضرورت ہے کہ شرعی علوم کا طالب علم کسی خاص قسم کی ٹکنیکل تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم سے الگ نہیں ہوتا جو ہر دن پابندی کے ساتھ مشق وٹریننگ کی غرض سے اپنے لیب یا تجربہ گاہ میں جاتا ہے۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک دن اسے عملی زندگی کے میدان میں اترنا ہی پڑے گا جب وہ حصول تعلیم کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد ایک قاضی شریعت یا ایک مدرس یا ایک امام وخطیب یا ایک فقیہ ومجتہد یا پھر ایک عام انسان کی طرح اپنے معاشرہ میں واپس جائے گا۔ اگر وہ باقاعدہ طور پر کسی عہدہ پر فائز نہ بھی ہوتب بھی شرعی علوم کی تحصیل کے بعد اس کی حیثیت ایک عام انسان کی نہیں رہ جاتی ہے کیونکہ لوگ اسے علوم شرعی اور اس کی فروعات کا عالم سمجھتے ہیں اور اس سے کوئی فقہی مسئلہ یا کوئی فتوی یا کسی حدیث کا معنی ومفہوم یا کسی آیت کریمہ کا مطلب دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا وہ عالم دین اپنے چھوٹے سے شہر کے لوگوں، اپنے پڑوسیوں اور اپنے اہل خانہ کے لئے ایک مفتی ومجتہد ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔''اسے شرعی علوم کی تحصیل کرنے والے انسان کی ذاتی کمی اور اس کا عیب ونقص ہی کہا جائے گا کہ حدیث،عقیدہ یا تفسیر میں سے کسی ایک فن میں تخصص کے بعد جب زندگی کے عملی میدان میں مسائل حلال وحرام سے اسے سابقہ پیش آئے تو وہ سائل سے یہ کہہ کر معذرت کرلے کہ چونکہ اس نے عقیدہ کا خصوصی علم حاصل کیا ہے اس لئے وہ اس فقہی مسئلہ پر روشنی ڈالنے یا اظہار خیال کرنے سے قاصر ہے''(۲۵)۔

یہاں پر مجھے ایک مثال یاد آرہی ہے کہ میری ایک ساتھی جو معہد برائے دعوت وذرائع ابلاغ کی فارغہ تھی،اس نے علم فقہ بہت معمولی اور برائے نام ہی حاصل کیا تھا،اس کی شادی ایک امام سے ہوگئی جس کی وجہ سے شہر کی بہت سی عورتیں روزمرہ کے مسائل دریافت کرنے کے لئے اس کے پاس آنے لگیں۔میری وہ ساتھی کافی حیران وپریشان ہوئی کہ آخر ان فقہی مسائل میں ان عورتوں کی کس طرح رہنمائی کرے، کیونکہ اس نے علم فقہ کا بہت معمولی اور ابتدائی حصہ حاصل کیا تھا اور وہ کلیہ برائے دعوت وذرائع ابلاغ سے فارغ ہوئی تھی۔اس مثال پر غور کرنے سے فن

مناظرہ وترجیح اور علمی مباحثہ کے فن کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ان فنون سے ہماری اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے،لہٰذا ہمیں طلبہ کوفن مناظرہ اور غلط استدلال کے بالمقابل صحیح استدلال کرنے کی ٹریننگ دینی چاہئے۔اس فن میں حکم اور اس کی متعلقہ دلیل کا ذہن میں استحضار ضروری ہوتا ہے اور یہ قدرت وصلاحیت احکام اور دلائل کو سمجھنے، انہیں یاد کرنے اور اس کی ضرورت واہمیت کا احاطہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔اس کے لئے درپیش مسائل کے درمیان اسے صحیح جگہ دینا بھی ضروری ہے تاکہ ذہن میں ان کا استحضار ممکن ہو یہ تخلیقی طرز فکر ہی کی ایک قسم ہے جن کی طلبہ کو دوران درس عملی مشق کرائی جاتی ہے یہ اور اس قسم کے دیگر علوم ایسی سرگرمیوں سے تعلق رکھتے ہیں جو عملی مشق کے محتاج ہیں،مثلاً وہ فن خطابت جو روزمرہ کے واقعات وحوادث کے مطابق ہو،اسی طرح قضائے شرعی کا علم جس میں باقاعدہ طور پر عدالتوں کی تمثیل اور متعلقہ عدالتی امور کی تطبیق کی ضرورت ہوگی اور مجالس قضاء جن میں مقدمات کو پیش کرنے اور دلیل وگفتگو کے ذریعہ حریف سے جرح کرنے کا طریقہ سکھایا جاسکتا ہے۔

۲-علمی مواد (درسی کتابوں) میں تخلیقی طرز فکر: درسی کتابوں کے مؤلفین اور درسی کتابیں طالب علم کو صرف علمی معلومات فراہم کرنے پر توجہ مرکوز کرتی ہیں،ان کتابوں میں عملی مشق شاذ ونادر ہی ہوتی ہے،اس لئے فہم اور احاطہ کے اعتبار سے طلبہ کے معیار کے لائق درسی کتابوں کا انتخاب ضروری ہے مثلاً طلبہ کو پڑھانے کے لئے ایسی جامع کتاب ہونی چاہئے جس میں مفردات اور بنیادی اصطلاحات کی تشریح ہو۔اہم مصادر ومراجع کے ذریعہ وہ کتاب تیار کی گئی ہو،زندگی سے مطابقت رکھنے والی مثالیں اس کے اندر دی گئی ہوں جنہیں طالب علم آسانی کے ساتھ سمجھ لے۔علاوہ ازیں اس درسی کتاب کا اسلوب آسان اور عام فہم ہو۔گھٹیا،کمزور اور مشکل اسلوب میں اسے ترتیب نہ دیا گیا ہو۔درسی کتاب کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہونی چاہئے کہ حذف واضافہ کے ذریعہ جدید وقدیم کے اعتبار سے اس کے اندر تنوع پیدا کیا گیا ہو؛

تا کہ طالب علم کو یہ معلوم ہو سکے کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں شرعی نصوص کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے میں اجتہاد و تخلیقیت کا عمل کیسے کامیابی کے ساتھ انجام دیا جا سکتا ہے۔ میری نگاہ میں پڑھانے والے کے ذریعہ انفرادی طور پر درسی کتابوں کا انتخاب اچھا نہیں کہا جا سکتا۔ چاہے وہ درسی کتاب قدیم ہو جس کی مثالیں، تشریح اور تفصیلات ایک خاص زمانہ کے لئے وضع کی گئی تھیں یا وہ کتاب جدید ہو جس میں قدیم فقہی نصوص ہی موجود نہ ہوں جنہیں پڑھنے کی طلبہ کو مشق کرانا انتہائی ضروری سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ زیر تدریس مادہ کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح نئی درسی کتابوں کی ایک خامی یہ بھی ہے کہ یہ عام طور پر کسی ایک ہی مسلک کو سامنے رکھ کر ترتیب دی جاتی ہیں چاہے وہ شافعی یا حنفی مسلک ہو یا کوئی اور مسلک۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی کہتے ہیں: ''شرعی علوم کے درس و تدریس سے تعلق رکھنے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ درسی کتابوں کی تالیف میں قدیم و جدید دونوں طریقوں کو جمع کرنے کی کوشش کریں۔ تالیف کے جدید طریقہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر فقہی موضوع میں علمی منہج کی پیروی کی جاتی ہے اور کتاب کی تالیف کے لئے سہل اور عام فہم اسلوب اپنایا جاتا ہے۔ اسی طرح شرعی علوم کے طالب علم کو قدیم مصادر سے جوڑنا بھی ضروری ہے تا کہ اسالیب اور موضوع کو پیش کرنے کے ان کے طریقہ کا طالب کو علم ہو سکے'' (۲۶)۔ اسی لئے میری نگاہ میں دو کتابوں کے دو قسم کے مواد کو ایک ساتھ جمع کرنا بھی ضروری ہے اور یہ کام اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ قدیم فقہی موضوعات کو جدید فقہی فروعات کے ساتھ ملایا جائے اور قدیم مواد میں پیش آنے والی نئی صورتوں اور نئے امور کا اضافہ کیا جائے۔ اسی طرح مادۂ فقہ کو نئی شکل وصورت دینا ممکن ہوگا، اس کام کے لئے مدرس کو پیشگی تیاری کرنے کی ضرورت ہوگی اور اسے گھنٹیوں کی تعداد اور مختلف کلاسوں کے مطابق مطلوبہ علمی مواد کو تیار کرنا ہوگا، اس معاملہ میں زیر تدریس طلبہ کی بھی رعایت کرنی ہوگی مثلاً یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم صرف عرب طلبہ کو پڑھانے جا رہے

ہیں یا صرف ملیشیائی طلبہ کی کلاس لے رہے ہیں یا یہ کہ کلاس میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے طلبہ ہیں۔ ان تمام احوال میں تدریس کے طریقہ میں تھوڑی تبدیلی بھی پیدا کرنی ہوگی۔ ایک ماہر و کامیاب مدرس ہی اس فن سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ مدرس یومیہ درس کے لئے مذکرۃ (ڈائری یا نوٹ) تیار کرے، اس مذکرہ کو متعدد قدیم وجدید کتابوں کی مدد سے تیار کرے جو طلبہ کے معیار اور مدرس کے طریقۂ تدریس کے مطابق ہو۔ ورنہ ایسی صورت میں کہاں سے تخلیقیت کا مظاہرہ ہو سکے گا جبکہ ہر مدرس ایک ہی درسی کتاب کو مختلف کلاسوں اور مختلف سالوں میں پڑھانے پر انحصار کرے گا؟ کیونکہ ہر کلاس کے طلبہ کے معیار کے مطابق ہی درس کے معیار اور مشتملات کا یقین ہونا چاہئے۔ مدرس کے لئے شروع میں یہ کام مشکل اور وقت لینے والا ضرور ثابت ہوسکتا ہے تاہم بعد میں تدریس کا یہ طریقہ بہت ہی دلچسپ اور لطف دینے والا بن جائے گا، اس لئے کہ اس عمل سے گزرتے ہوئے خود مدرس کو یہ احساس ہوگا کہ وہ خود حقیقت میں تخلیقیت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اگر اسے اس طرح کا احساس ہو جاتا ہے تو پھر طلبہ کو تخلیقیت اور غور وفکر پر آمادہ کرنے میں اسے بہت آسانی ہوگی۔

مثال کے طور پر فقہ عبادات میں منجمد قطب شمال کے رہنے والوں کے لئے نمازوں اور روزے کے اوقات کا اعتبار کرنا، کھیت کی پیداوار اور سبزیوں میں زکاۃ واجب ہے یا نہیں؟ حصص اور بونڈس (معاہدہ نامے) کے مسائل، کارخانوں کے آلات اور تجارتی کمپنیوں کی آمدنی سے متعلق مسائل۔ اسی طرح فقہ معاملات میں مشترکہ تجارتی سرگرمیوں کو لیا جائے تو اب اس کی قدیم چار شکلیں (مضاربت، عنان، وجوہ اور ابدان) ہی نہیں رہ گئی ہیں بلکہ اب تو کئی نئی شکلیں بھی اس میں داخل ہو چکی ہیں مثلاً متعینہ حصہ داری پر مبنی مشترکہ تجارت اور غیر متعینہ حصہ داری پر مبنی مشترکہ تجارت وغیرہ۔ اس دور جدید میں قبضہ کی متعدد شکلیں وجود میں آ چکی ہیں۔ پہلے صرف قبضہ بالید ہی کی شکل ہوا کرتی تھی اب قبضہ کی کئی نئی شکلیں پیدا ہو چکی ہیں اور آج کے زمانہ میں

وکالت کا پیشہ دور قدیم میں وکالت کے سبق کی اہم شکلوں میں شامل ہو چکا ہے۔ پہلے ہم لوگ حرام بیع وشراء میں صرف بیع ملاقیح وبیع مضامین وغیرہ ہی کو جانتے تھے، اب خون اور انسانی اعضاء کی خرید وفروخت کے مسائل بھی اس میں شامل ہو چکے ہیں۔ پہلے صرف حوالہ اور مقاصہ کے مسائل ہوا کرتے تھے، اب اس میں کئی جدید چیزیں داخل ہوگئی ہیں مثلاً کریڈٹ کارڈ اور گارنٹی کارڈ وغیرہ۔ پہلے اولاد کے حصول کے لئے مرد وعورت کے جنسی عمل کو کافی سمجھا جاتا تھا، اب بات اس سے آگے بڑھ کر مصنوعی حمل کاری کی متعدد شکلیں سامنے آچکی ہیں مثلاً خوردبین کی مدد سے حمل کاری، نلکیوں (Tube) کے ذریعہ بچوں کی پیدائش، اجرت پر رحم مادر کا استعمال اور ہمزاد (clone) تیار کرنے کا طریقہ وغیرہ۔

مادۂ اصول فقہ جس کے اندر جدت وتبدیلی کے بارے میں ہم اکثر سنتے رہتے ہیں، اس مادہ میں یہ نئے مسائل اور کھل کر سامنے آئے ہیں۔ پہلے اصول فقہ کے منہج سے دور قدیم کے مسائل ومعاملات حل کئے جاتے تھے۔ ڈاکٹر حسن ترابی اصول فقہ کے روایتی منہج کے بارے میں کہتے ہیں: ''اس پر اس تاریخی صورتحال کی چھاپ ہے جس میں اس کی نشونما ہوئی ہے بلکہ اس پر ان فقہی مسائل کی گہری چھاپ پائی جاتی ہے جن پر فقہی بحث ومباحثہ ہوا کرتا تھا'' (۲۷)۔ اس بنیاد پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مسائل کے استنباط کے منہج میں ترقی وتبدیلی لانا، جس میں اصول فقہ کا منہج بھی شامل ہے، آج کے دور میں پیش آنے والے نئے مسائل ومعاملات کو حل کرنے کی بنیاد ہے۔ علاوہ ازیں شریعت اسلامی کی قانونی دفعات تیار کرنے کی فکر کے ساتھ اس کا مضبوط تعلق ہونا بھی ضروری ہے۔ ''جو دلائل کے استعمال میں مستحکم اصولی منہج اختیار کرنے کو ضروری قرار دیتی ہے'' (۲۸)۔ اسی وجہ سے ایک اسکالر کو اصول فقہ کی قانونی دفعات تیار کرنے پر آمادہ ہونا پڑا (۲۹)۔

اس اعتبار سے ہم علم اصول فقہ کے مادہ کو تخلیقی وتنقیدی فکر ونظر سے آراستہ ہونے کی

اہمیت کو بیان کرنے کے لئے ایک بلند نمونہ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں تا کہ اصول فقہ کے درس میں عمومی طور پر نصوص وحی سے شرعی احکام کے استنباط کے تمام قواعد وضوابط شامل ہو جائیں اور اس کے ذریعہ ابتدائی طور پر نئے مسائل وآفات سے متعلق شرعی احکام بھی سامنے لائے جائیں۔ یہ ساری چیزیں طلبہ کے معیار کے مطابق ہونی چاہئیں تا کہ اخیر میں ان کے اندر دلائل کے ذریعہ مسائل کے استنباط کا ملکہ پیدا کرنے میں یہ معاون بنے۔

۳-تخلیقی غور وفکر طالب علم کی سطح پر: عام طور پر شرعی علوم حاصل کرنے والا طالب علم جب اپنے ایسے ہم عمروں کے درمیان ہوتا ہے جو ٹیکنیکل تعلیم سے جڑے ہوتے ہیں تو وہ شرعی علوم سے تعلق رکھنے کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ یہ احساس کمتری اس کے اندر تخلیقی واجتہادی صلاحیت کی روح کو ختم کر دیتی ہے۔ بہت کم ہی ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ اسلامی علوم سے تعلق رکھنے والے کسی طالب علم نے فخر سے سر اٹھا کر یہ کہا ہو کہ میں اسلامی علوم کا طالب علم ہوں، بلکہ وہ جھینپتے ہوئے اس جملہ کو اپنی زبان سے ادا کرتا ہے، حالانکہ یہ علم دنیا کے تمام علوم سے زیادہ بلند مرتبہ کا حامل ہے اور اللہ کی رضا وخوشنودی کو حاصل کرنے میں سب سے مختصر اور آسان ترین راستہ بھی یہی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہی وہ علم ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستہ، اس کی شریعت اور اس کے واجب کردہ احکام کی جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ شاید شرعی علوم کے طالب علم کو یہ تصور ہوتا ہے کہ اسلامی علوم جن کا بلاواسطہ طور پر قرآن وسنت سے تعلق ہے، اگر وہ اسے پڑھنے کے بعد غلطیوں کا ارتکاب کرے گا تو اس کے لئے کئی طرح کی پریشانیاں پیدا ہو جائیں گی، کیونکہ اس کے غلطی کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے شرعی نصوص اور فقہاء کی آراء کو سمجھنے میں غلطی کی۔ حالانکہ حق بات یہ ہے کہ غلطی کرنے کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اس لئے کہ ہر انسان سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، چاہے اس کا تعلق جس تعلیم سے بھی ہو۔ اسی لئے یہ بات مفید اور پسندیدہ ہے کہ طالب علم کو ہفتہ واری رپورٹیں لکھنے کی

مشق کرائی جائے تا کہ مفردات اور شرعی اصطلاحات کو استعمال کرنے میں اسے آسانی ہو۔ اکثر وبیشتر ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم شرعی اصطلاحات کو سنتا ہے اور ایک دو بار اسے استعمال کرنے کے بعد بھول جاتا ہے۔ مگر جب طالب علم ہفتہ واری رپورٹیں تیار کرنے کی مشق کرے گا، پھر مناقشہ کی گھنٹیوں میں ان پر اجتماعی طور پر مناقشہ کرے گا تو اس سے طالب علم کے اندر تخلیقی غور وفکر کی روح بیدار ہوگی، کیونکہ جن چیزوں کو اس نے لکھا ہوگا اور اپنے ساتھیوں کے سامنے پیش کیا ہوگا اس کے اندر غور وفکر کرنے کا بھی اسے موقع ملے گا۔ مزید یہ کہ اسے سمیناروں، عام محاضرات اور کانفرنسوں میں بھی شرکت کرنی چاہئے جن سے طالب علم کو نئی تحقیقات ونئی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اور معاشرہ میں پیش آنے والے نئے نئے مسائل وآفات کی جانکاری بھی حاصل ہوتی ہے اس کے ذریعہ اسے بحث وتحقیق کے راستے معلوم ہوتے ہیں، بحث وتحقیق کو پیش کرنے کا ہنر آتا ہے، طالب علم کو اس سے جرأت وحوصلہ ملتا ہے اور مباحثہ میں شریک ہونے، سوالات کرنے، نقد وتبصرہ اور استدراک کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔

طلبہ کے اندر تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے اور تنقیدی شعور بیدار کرنے کی غرض سے درس دینے والے اساتذہ مندرجہ ذیل طریقے اختیار کر کے مدارس وجامعات کے اندر تخلیقی وتنقیدی غور وفکر کا ماحول پیدا کر سکتے ہیں: مثال کے طور پر اس کام کے لئے عام درسی کتابوں میں مفید اضافہ کی غرض سے نصابی مواد تیار کیا جائے، اختلافی مسائل پر باہم گفتگو اور مباحثوں کا انعقاد کیا جائے، تاریخی واقعات سے متعلق رول ادا کرنے کے لئے طلبہ کو آمادہ کیا جائے، اس طور پر کہ مختلف ٹولیاں ایک دوسرے کے برخلاف نقطہ اپنائیں، مقامی اجتماعات میں شرکت پر طلبہ کو آمادہ کیا جائے، انہیں ٹیلی ویژن پر ایسے پروگرام دیکھائے جائیں جن میں مختلف قسم کے نقطہائے نظر پیش کئے جاتے ہیں، کسی مقامی مسئلہ پر اپنی آراء کا اظہار کرنے کے لئے طلبہ کو اخبارات ورسائل میں خطوط نویسی پر ابھارا جائے۔ اخبارات میں شائع ہونے والے مقالات اور اس قسم کے دیگر مواد

کا تجزیہ کرنے کے لئے ان کی ہمت افزائی کی جائے تا کہ واضح طور پر جانبداری اختیار کرنے کی مثالیں سامنے آئیں۔ متعدد بار جوابات دینے کے ذریعہ سوالات کا سامنا کرنے کی ان کو آزادی دی جائے۔ جن اقدار وتقالید سے طلبہ کا تعلق ہو ان کے برعکس تقالید واقدار کی ترجمانی کرنے والے ادب کو پڑھنے اور اس پر مباحثہ کرنے کے لئے طلبہ کو آمادہ کیا جائے۔ برعکس نقطہائے نظر کی حامل شخصیات کو طلبہ سے بات چیت کرنے کی دعوت دی جائے وغیرہ (۳۰)۔

یہاں پر میں تاکیدی طور پر یہ بات کہنا چاہتی ہوں کہ تخلیقی صلاحیت کا حامل طالب علم خالی بیٹھ کر وقت ضائع کرنے سے وجود میں نہیں آئے گا بلکہ اس کے لئے تخلیقی صلاحیت کے حامل فعال مدرس کی فراہمی کے ساتھ تخلیقی تعلیمی مواد اور تعمیری ومتحرک اور تنقیدی شعور کے حامل تدریسی وسائل کی فراہمی بھی ضروری ہے، کیونکہ تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے کی غرض سے دی جانے والی تعلیم کی بنیادی شرائط میں یہ شامل ہے کہ اس کے لئے تخلیقی صلاحیت کے حامل مدرس، تعمیری وٹھوس مواد اور محنتی طالب علم کے وجود کو یقینی بنایا جائے۔

۴-اصول فقہ کے نصاب کی تجدید کے دعوے میں تخلیقیت کی جھلک

اصول فقہ کی تجدید اور جن مقامات پر تجدید وتبدیلی اور تنقیح ومنسوخی کا عمل انجام پانا چاہئے۔ اس کے بارے میں بہت ساری باتیں ہو چکی ہیں۔ اس اعتبار سے اب اصول فقہ محض ''اجمالی طور پر فقہ کے راستوں کے مجموعے کو جاننے، ان سے استدلال کے طریقوں اور مستدل کی صورتحال کا علم رکھنے'' (۳۱)۔ یا پھر'' چند قواعد وضوابط اور اجمالی دلائل جن کے ذریعہ فقہ کے استنباط تک رسائی حاصل ہو سکے'' (۳۲)۔ ہی کا نام نہیں رہا، کیونکہ اصول فقہ کی یہ تعریف اس کے منہج اول سے تعلق رکھتی ہے جو تفصیلی دلائل سے تشریعی احکام کے استنباط کا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا اصول فقہ کے منہج ثانی سے کوئی تعلق نہیں ہے جو معاشرہ میں پیش آنے

والے نئے واقعات وحوادث سے متعلق احکامات کو جاننے سے عبارت ہے۔ اصول فقہ میں ترقی وتبدیلی لانے کی یہ ایک اہم وجہ ہے، کیونکہ اگر اصول فقہ کا منہج انسانی زندگی کی سرگرمیوں سے تعلق رکھتا ہے تو اس میں ترقی وتبدیلی ناگزیر ہے۔ احکام کے استنباط کا قدیم منہج جس کا ظہور امام شافعی کی علمی سرگرمیوں کے ساتھ ہوا تھا، شرعی احکام کے استنباط کے لئے اس کا رخ نصوص کی طرف ہوتا تھا، جبکہ آج کے دور کا قابل عمل منہج یہ ہے کہ فقیہ کی نگاہ معاشرہ میں پیش آنے والے واقعات وحوادث کی طرف ہو اور ان سے متعلق احکامات کو جاننے کے لئے نصوص میں غور وفکر کیا جائے۔

اس وقت اصول فقہ کی تجدید کی چند ممکنہ شکلیں یہ ہیں:

۱-علم اصول فقہ سے جس کا تعلق نہیں ہے اسے منسوخ کیا جائے: یہ بات معروف ومتداول ہے کہ اس علم کے مصادر کلامی قواعد وضوابط اور عربی زبان کے قواعد وضوابط دونوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن پر بہت زیادہ بحث ومباحثے اور مناقشے پہلے ہی ہو چکے ہیں۔ ''معتزلہ اور اشاعرہ نے اصول فقہ کے نئے قواعد وضوابط وضع کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ اغیار پر عقلی وفکری فتح حاصل کرنے میں ان سے مدد لی جاسکے'' (۳۳)۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اصول فقہ کے منہج ثانی ہی نے قدیم اصولیوں کو استنباط کے ایسے نئے طریقے ایجاد کرنے کی دعوت دی جن کا علم کلام اور عربی زبان کے مباحث سے کوئی تعلق نہ ہو، مثال کے طور پر استحسان، سد ذرائع اور مصالح مرسلہ جیسے مباحث جن پر نظر ثانی کی شدید ضرورت ہے۔

۲-بعض دلائل کے مفاہیم کے از سر نو تعیین اور اس میں ضرورت کے مطابق تبدیلی مثال کے طور پر اجماع کا مبحث ہے جس کی تعریف ہی پر سب سے پہلے اشکال ہوتا ہے۔ اسی طرح اجتہاد کا مبحث اور اس کی وہ شروط جن کی تکمیل انسان کی قدرت واستطاعت سے باہر ہے اور جس کی وجہ سے اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور اجتماعی اجتہاد پر انحصار کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اور اس جیسے دوسرے مسائل جن کی تفصیلات میں جانے کا یہاں موقع نہیں

ہے۔ان مسائل پر سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

۳- مقاصد شرعیہ کی بھرپور طور پر تدریس: اس لئے کہ قدیم طریقوں سے احکام کے استنباط کا مقصد پورا ہوتا ہوا نظر نہیں آتا ہے اور قیاس کے ذریعہ احکام کے استنباط کی جتنی گنجائش تھی وہ تقریباً ختم ہو چکی ہے، اس کی وجہ سے بعض اصولیوں کو ایک نئے مبحث مقاصد شریعت کو وضع کرنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ شرعی نصوص میں اجتہادی نقطۂ نظر کی پابندی کے ساتھ عمومی انداز میں غور وفکر کیا جاسکے لیکن یہ عمومی غور وفکر بھی شارع حکیم کے مقاصد کے دائرہ کے اندر ہوگا، نیز اصولیوں نے جزئیاتی گوشہ سے تجاوز کر کے عمومی اور انفرادی مسائل پر کلی انداز میں غور وفکر کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

یہ جوینی ہیں جنہوں نے فقہاء کے نزدیک ضرورت کے نظریہ پر غور وفکر کے ذریعہ جس کا تعلق افراد سے ہے، اجتماعی ضرورت کا انکشاف کیا جس کے تحت پانچ ضرورتیں آتی ہیں۔ چنانچہ امام جوینی رحمہ اللہ نے معاشرہ کے قیام میں اس کے اثرات کا اعتبار کر کے مقاصد شریعت کی پہلی مرتبہ تین قسمیں کیں؛ یعنی ضرورات، حاجیات اور تحسینات۔ انہوں نے اپنی اس اجتہادی کوشش میں فقہاء کے قدیم مبحث ضرورت ہی سے رہنمائی حاصل کی ہے جسے فقہاء نے افراد کے ساتھ خاص کیا ہے مثلاً (مردار کھانا اور غصہ کی حالت میں شراب پینا وغیرہ) اس نئے انکشاف کے وقت ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر کسی زمانہ میں فقہاء کا وجود ہی نہ رہے تو پھر ایک عام انسان حرام سے حلال کی تمیز کیسے کرے گا۔

امام غزالی رحمہ اللہ کے شیخ جوینی نے جہاں تک رسائی حاصل کی تھی اسے امام غزالی نے مزید ترقی سے ہمکنار کیا اور اسے کسی زمانہ میں مجتہدین کے ناپید ہونے پر منحصر نہیں کیا بلکہ اسے مصلحت مرسلہ کے مفہوم میں داخل کر دیا اور اس مصلحت مرسلہ کی اساس وبنیاد بنا دیا، چنانچہ ہر وہ معاملہ جس کے اعتبار یا الغاء (منسوخی) سے متعلق کوئی شرعی حکم صراحت کے ساتھ موجود نہیں

تھا اسے انہوں نے مقاصد شریعت کی حفاظت کی طرف لوٹایا جس سے پانچ ضرورتوں کی حفاظت اور اس کی تکمیل کرنے والی چیزیں نکلی ہیں اور اب یہی فقہی ضابطہ بن گیا ہے۔ اس کے بعد امام رازی اور امام آمدی رحمہما اللہ آتے ہیں، یہ دونوں مقاصد شریعت کے فکر وخیال کا احاطہ کرنے کے بعد ضروریات کی تینوں بنیادی اقسام کو ترجیحات کے باب میں داخل کر دیتے ہیں۔ امام رازی نے تو صرف اس کی دعوت دی ہے اور تینوں اقسام کے درمیان ترجیحات قائم نہیں کی ہے لیکن امام آمدی نے دین کے کلیہ کو نفس کے اوپر اور نفس کے کلیہ کو مال کے اوپر مقدم کرنے میں ترجیح وموازنہ کا استعمال کیا ہے جبکہ عز بن عبد السلام رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ تمام اوامر ونواہی یا تو مقاصد شریعت کے اندر داخل ہیں یا ان مقاصد تک پہنچنے کے وسائل ہیں، اس کی وجہ سے آپس میں متعارض مصلحتوں کے درمیان موازنہ وترجیح قائم کرنے میں بعد کے لوگوں کو آسانی ہوئی ہے اور مصالح ومفاسد کے درجات کو جاننے میں بھی اس سے آسانی ہوئی ہے۔

اس کے بعد امام شاطبی آتے ہیں جنہوں نے اپنے دونوں پیش رؤوں کی طرح مقاصد شریعت کے فکر وخیال کو قیاس کے باب میں علت کی بحث کے ایک چھوٹے حصہ کے طور پر نہیں لیا بلکہ اسے خصوصی طور پر بحث وتحقیق اور مطالعہ کا موضوع بنایا اور انہوں نے اسے بہت سے اصولی مباحث کا منہجی ضابطہ بنا دیا اور اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے مقاصد شریعت کی تفصیلات بیان کیں جن میں انہوں نے متعلق تمام تفصیلات وفروعات اور اس سے متعلق تجزیوں اور جزئیات کو شامل کیا۔ انہوں نے وسائل کے فکر وخیال اور حفاظت کے عمل کو ترقی دیتے ہوئے مقاصد شریعت کے موضوع کے متعدد مباحث ترتیب دیئے۔ شاطبی نے نصوص آحاد کے درمیان تعارض وٹکراؤ کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نصوص کے کلیات اور نظر جزئی سے نظر کلی کی طرف منتقل ہونے کے طریقہ کا انکشاف کیا۔ انہوں نے ہی مقاصد شریعت کی وضاحت کے لئے تیار کئے ہوئے اپنے مسالک میں تخلیقیت کا مظاہرہ کیا۔ وہ مسالک نصوص آحاد میں غور وفکر کے ذریعہ ان

کلیات وعمومات تک پہنچنے کی دعوت دیتے ہیں جن میں وحی کے نصوص شامل ہوتے ہیں (۳۴)۔

موجودہ دور میں ابن عاشور مقاصد شریعت کی میراث کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور مقاصد شریعت کو بطور خاص بحث وتحقیق کا موضوع بنانے اور اس کا وسیع تجزیہ کرنے کے معاملہ میں شاطبی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مقاصد شریعت سے متعلق امام جوینی اور ان کے بعد امام غزالی کے افکار ونظریات میں بھی بہتری کی صورت نکالی ہے، جنہوں نے مقاصد شریعت کی تینوں بنیادی اقسام سے استفادہ کیا تھا اور اسے مصالح اور قیاس کلی کے باب میں شمار کیا ہے (۳۵)۔ پھر انہوں نے ان کلیات کو عمومی طور پر نہ کہ صرف انفرادی طور پر محفوظ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

اب بقیہ کام موجودہ دور کے محققین کا ہے کہ وہ مقاصد شریعت کو مزید بہتر شکل دینے کی کوشش کریں اور اسے اصول فقہ کی تدریس ومطالعہ کے عمومی دائرہ کے اندر شامل کریں۔ کیونکہ اصول فقہ کے منہج میں اس وقت فقہی استنباط کی تمام علمی خصوصیات موجود نہیں ہیں، الا یہ کہ مقاصد شریعت کو بھرپور طور پر مطالعہ اور بحث وتحقیق کا موضوع بنایا جائے۔ اسی وجہ سے مقاصد شریعت کا ایک جامع وبھرپور مطالعہ علم اصول فقہ کی تجدید وبہتری کی سب سے زیادہ لازمی ضرورتوں میں سے ایک ہے؛ تاکہ یہ علم دور جدید میں اجتہاد کے تقاضوں کو زیادہ بہتر طور پر پورا کر سکے (۳۶)۔ اس لئے کہ آج مسلم معاشرہ میں پیش آنے والے نئے نئے امور ومصائب وآفات کے متعلق تفصیلی احکامات آپ کو قرآن مجید اور سنت نبوی کے نصوص میں نہیں ملیں گے، ہاں البتہ عمومی مقاصد اور قاعدے کلیے کے تحت کچھ چیزیں اس میں شامل ہوسکتی ہیں۔

خاتمہ:

اس تحقیقی مقالہ کے اختتام پر میری خواہش ہے کہ میں اپنی بحث وتحقیق کی وسعت کو بطور

خلاصہ وماحصل چند جملوں میں سمیٹ دوں اور وہ یہ ہے کہ اسلامی علوم کی تدریس کے وقت اس بات کا خاص دھیان رکھا جائے کہ یہ دینی ودنیاوی دونوں اعتبار سے مسلمانوں کی زندگی کو صحیح رخ عطا کرنے والے ہیں اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ طلبہ کو زیر تدریس علمی مواد اور زندگی کی موجودہ صورتحال کے ساتھ تعامل کے معاملہ میں تخلیقی اسالیب اختیار کرنے کی مشق نہ کرائی جائے۔ نیز اس کے لئے ایسے تدریسی پروگرام وضع کرنے کی بھی ضرورت ہوگی جو موجودہ دور میں امت مسلمہ کی ضرورتوں کے موافق ہوں اور اخیر میں شرعی علوم کو مسلمانوں کی زندگی میں اس طور پر رواں دواں کرنا ہوگا کہ ابتداء میں ان کے ذریعہ زندگی کے صحیح راستہ کا تعین ہوگا اور پھر آگے چل کر یہی شرعی علوم مسلم معاشرے کی ترقی ونشأۃ ثانیہ کا زینہ بنیں گے۔

وصل اللهم وسلم على سيدنا محمد وعلى آله وصحبه ومن تبعه بإحسان إلى يوم الدين.

☆☆☆

حاشیہ

زیرنظر تحریر ایک تحقیقی مقالہ ہے جسے بتاریخ ۴ تا ۶ راگست ۲۰۰۴ء مرکز بوتر برائے عالمی تجارت، کوالالمپور میں ''الاسلام والمسلمون فی القرن الواحد والعشرین: الصورۃ والواقع'' کے عنوان سے منعقد بین الاقوامی کانفرنس میں پیش کیا گیا۔

۱- ابراہیم احمد مسلم، ''**الجدید فی أسالیب التعلیم: حل المشکلات، تنمیة الإبداع وتسریع التفکیر العلمی**'' ص:۱۳۵، مطبوعہ دارالبشیر عمان، ۱۹۹۴ء

۲- عمر عبید حسنہ، ڈاکٹر حسن ہنداوی کی کتاب ''**التعلیم وإشکالیة التنمیة**'' کے مقدمہ سے ماخوذ، ص: ۲۳، مطبوعہ وزارت اوقات واسلامی امور دوحہ، قطر، ۲۰۰۴ء

۳- عمر عبید حسنہ، ڈاکٹر محمد عثمان شبیر کی کتاب ''**تکوین الملکة الفقهیة**'' کے مقدمہ سے ماخوذ، ص:۳۹، مطبوعہ وزارت اوقاف واسلامی امور، دوحہ، قطر، ۱۹۹۹ء

۴- ابراہیم احمد مسلم، ''**الجدید فی أسالیب التعلیم**'' مرجع سابق، ص:۱۴۲۔

۵- محمد معین صدیقی، ''**الأسس الإسلامیة للعلم**''، ص:۵۸، مطبوعہ المعہد العالی للفکر الاسلامی، ہیرنڈن، ۱۹۸۹ء

۶- یعقوب حسین نشوان، ''**اتجاهات معاصرة فی مناهج وطرق تدریس العلوم**'' ص:۱۴۱، مطبوعہ دارالفرقان عمان، ۱۹۹۴ء

۷- محمد معین صدیقی، ''**الأسس الإسلامیة للعلم**'' مرجع سابق ص:۵۷

۸- محمد اسماعیل محمد البانی ''**التفکیر الناقد ودوره فی التعلیم الفعال**'' ص:۳

۹- عبدالرحمٰن صالح مشیقح '' **الطریق إلی الإبداع**'' ص:۲۲ بحوالہ مجلّہ جامعۃ اُم القری میں شائع شدہ مقالہ ''نحو تطویر العمل الإبداعی''، ص:۱۶۳، مقالہ نگار: صالح بن درویش حسن معمار۔

۱۰- مرجع سابق ص: ۱۶۳

۱۱- محمد حمد عقیل طیطی، "مهارات التفکیر الایجابی فی المدرسة الأساسیة" ص: ۱۷ یہ مقالہ فطری اور اعلی صلاحیت کے طلبہ پر توجہ سے متعلق عرب دنیا کی تیسری علمی کانفرس منعقدہ عمان ۲۰۰۳ء میں پیش کیا گیا۔

۱۲- دیکھئے مندرجہ ذیل کتابیں:

" التربیة"، "اتجاهات التعلیم" اور "فلسفة التربیة"۔

۱۳- فتحی حسن ملکاوی، "البحث التربوی وتطبیقاته فی الدراسات الإسلامیة فی الجامعات" یہ مقالہ مجلۃ اسلامیہ المعرفۃ، شمارہ: ۳۰ (خریف ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء) ص: ۸۵ پر شائع ہوا ہے۔

۱۴- "توظیف تقنیة المعلومات فی تدریس العلوم الشرعیة" ص: ۳ یہ مقالہ ملیشیا یونیورسٹی میں ۲۰۰۴ء میں "نحو صیاغة حدیثة لمقررات الدراسة الشرعیة" کے موضوع پر منعقد سمینار میں پیش کیا گیا۔

۱۵- فتحی حمودہ بیومی "التربیة والطرق الخاصة بتدریس العلوم الإسلامیة" ص: ۵۴ بحوالہ مروان قدومی، "طرق تدریس الفقه الإسلامی" ص: ۱۹۷، یہ مقالہ جامعۃ الزرقاء الأہلیۃ، کی کلیۃ الشریعۃ میں ۲۰۰۰ء میں منعقد ہونے والی دوسری کانفرس میں پیش کیا گیا۔

۱۶- شہاب الدین قرافی، "الفروق" ج: ۱ ص: ۳ مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت۔

۱۷- جلال الدین سیوطی، "الأشباه والنظائر" ص: ۲ مطبوعہ دار الفکر، بیروت۔

۱۸- أیمن ابو عذبہ، "فلیعلموا لماذا یتعلمون: تطبیقات العلوم فی الحیاة – مادة للطلبة الموهوبین" ص: ۱، یہ مقالہ فطری واعلیٰ صلاحیت کے حامل طلبہ پر

خصوصی توجہ سے متعلق عالم عرب کی تیسری علمی کانفرنس میں پیش کیا گیا۔

۱۹- محمد اسماعیل محمد البانی، ''التفکیر الناقد و دورۃ فی التعلیم الفعال'' مرجع سابق ص:۲۲

۲۰- مادجلاد، ''المفاهیم الإسلامیة و أسالیب تدریبها'' مرجع سابق ص: ۴۲۴، یہ مقالہ جامعۃ الزرقاء الأہلیۃ کی کلیۃ الشریعۃ میں منعقد ہونے والی دوسری کانفرنس میں پیش کیا گیا۔

۲۱- جمال بادی ''تطویر أسالیب تدریس العلوم الشرعیة'' مرجع سابق، ص:۲، یہ مقالہ ''نحو صیاغۃ حدیثۃ لمقررات الدراسۃ الشرعیۃ'' کے عنوان سے منعقد ہونے والے سمینار میں پیش کیا گیا۔

۲۲- مرجع سابق، ص:۵

۲۳- محمود محمد علی، ''تنمیة مهارات التفکیر''، ص: ۱۰۴، مطبوعہ دار المجتمع للنشر والتوزیع جدۃ، ۲۰۰۲ء

۲۴- عادل ابو العز احمد سلام ''عن تصور مستقبلی لمناهج العلوم فی مرحلة التعلیم الأساسی فی ضوء متطلبات العصر'' ص:۱۷، یہ مقالہ فطری صلاحیت کے حامل طلبہ پر خصوصی توجہ سے متعلق عالم عرب کی تیسری علمی کانفرنس میں پیش کیا گیا۔

۲۵- محمد سعید حوی، ''ما الذی نریده من طالب الشریعة فقهاء'' ص: ۱۱۴، جامعۃ الزرقاء الأہلیۃ کی کلیۃ الشریعۃ میں منعقد ہونے والی دوسری کانفرنس میں یہ مقالہ پیش کیا گیا۔

۲۶- وہبہ زحیلی، ''الکتابات الفقهی الجامعی: الواقع والطموح'' ص: ۲۴۲، مرجع سابق یہ مقالہ کلیۃ الشریعۃ کی دوسری کانفرنس میں پیش کیا گیا۔

۲۷- حسن ترابی، ''قضایا التجدید: نحو منهج أصولی'' ص:۱۹۵، مطبوعہ معهد البحوث والدراسات الاجتماعیۃ، خرطوم، ۱۹۹۰ء

۲۸- محمد کمال الدین امام، "نحو تطویر تدریس علمی أصول الفقه والفقه" ص: ۷، یہ مقالہ مجلۃ المسلم المعاصر، شمارہ: ۱۱۲ (اپریل رجون ۲۰۰۴ء) میں شائع ہوا۔

۲۹- دیکھئے محمد زکی عبدالبر کی کتاب "تقنین أصول الله" مطبوعہ دار التراث القاہرۃ ۱۹۸۹ء

۳۰- محمد صالح خطاب، "رعایة تعلیم التفکیر فی المدارس" مرجع سابق ص: ۱۸، یہ مقالہ عالم عرب کی تیسری علمی کانفرنس میں پیش کیا گیا۔

۳۱- فخر الدین رازی، "المحصول" ج: ۱، ص: ۸۰، طبع ثالث، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۹۹۸ء

۳۲- عبد الکریم زیدان، "الوجیز فی أصول الفقه" ص: ۱۱، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۹۹۸ء

۳۳- قطب سانو، "المتکلمون وأصول الفقه" یہ مقالہ مجلۃ اسلامیہ المعرفۃ، شمارہ: ۹ (۱۹۹۷ء) میں ص: ۴۴ پر شائع ہوا ہے۔

۳۴- فریدہ زوزو، "النسل: دراسة مقاصدية فی وسائل حفظه فی ضوء تحدیات الواقع المعاصر" ص: ۲۹ اور اس کے بعد صفحات، مطبوعہ دار الرشد، ریاض، ۲۰۰۴ء

۳۵- محمد طاہر ابن عاشور، "مقاصد الشریعة الإسلامیة" ص: ۸۳، تحقیق: محمد طاہر میساری، مطبوعہ دار النفائس، عمان: ۱۹۹۹ء

۳۶- محمد دسوقی، "نحو منهج جدید لدراسة علم أصول الفقه" یہ مقالہ مجلۃ اسلامیۃ المعرفۃ، شمارہ: ۳ (۱۹۹۶ء) ص: ۱۳۶ پر شائع ہوا ہے۔

☆☆☆